وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

کچھ یاد رہا
کچھ بھول گیا

کچھ تجھ کو خبر ہے کیا کیا ہم، اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

کم وبیش ستر برس کی بکھری ہوئی کتاب زندگی کے چند یاد رہ جانے والے واقعات، جن کو قرطاس وقلم کے سپرد کرتے ہوئے کبھی لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، تو کبھی آنکھ سے آنسو چھلک پڑے۔ ع

اے کاش کہ وہ دن واپس آتے

از قلم
مولانا عبدالعلی فاروقی
(فاضل دیوبند-ایم،اے)

اشاعت اول	....	مئی ۲۰۲۵ء
نام کتاب	....	کچھ یاد رہا، کچھ بھول گیا
نام مصنف	....	مولانا عبدالعلی فاروقی (فاضل دیوبند، ایم اے)
		E-mail:aafarooqi4@yahoo.com
		Ph. No. 9415775044, 8756107914
کمپوزنگ	....	عبدالقدوس ندوی
صفحات	....	۲۴۸
تعداد	....	۴۰۰
ناشر	....	مولانا عبدالعلی فاروقی
طباعت	....	لونا پرنٹنگ پریس، کٹرہ ابوتراب خاں نخاس، لکھنؤ
قیمت	....	₹ 300/= (تین سو روپئے صرف)

ملنے کا پتہ

مکتبہ البدر کاکوری، لکھنؤ، انڈیا

MAKTABA AL-BADR

KAKORI, LUKCNOW-226101 (INDIA)

Phone No. 9450110463, 9839181475

یہ کتاب

(الف)

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی
کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

(ب)

اس کتاب کے مندرجات سے
اتر پردیش اردو اکادمی کا متفق ہونا
ضروری نہیں ہے۔

فہرس

کیا ـــــ کہاں

انتساب

یہ کتاب زندگی کے اس حسین لمحہ کے نام جس میں کسی خارجی اثر و دباؤ کے بغیر اپنے گناہوں پر اپنے پروردگار کے سامنے دل کی گہرائیوں سے نادم ہونے کی توفیق ملی ہو ——— اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ گئے ہوں۔

ندامت کے یہ آنسو باتوفیق لوگوں ہی کے حصہ میں آتے ہیں —— اور ان ہی آنسوؤں کے بارے میں دل کو یقین ہوتا ہے کہ

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سراپا گناہ سہی، لیکن رحمت رب سے امیدوار ہوں کہ موت کو گلے لگانے سے پہلے ندامت کے یہ آنسو مجھے بھی ضرور عطا ہوں گے

مری زندگی، تری بندگی، مرا شیوہ عجز و نیاز ہے
میں گدائے عاجز و بے نوا، تو کریم و بندہ نواز ہے
تری قدرتوں کے مظاہرے، ہیں زمیں سے تا حد آسماں
تری حکمتیں ہیں سبھی عیاں، تو درونِ پردۂ راز ہے

سپاس گذار
عبد العلی فاروقی
یکم رمضان ۱۴۴۵ھ مطابق ۱۲/ مارچ ۲۰۲۴ء

کیا ہے اس کتاب میں؟— چل مرے خامے، بسم اللہ

آپ بیتی یا خودنوشت لکھنے کے بارے میں کبھی میں اس لئے نہیں سوچ سکا کہ بغیر کسی تصنع اور ریا کاری کے اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ میری پراگندہ اور عام سی سرگذشت حیات میں ایسی کوئی کشش نہیں ہے کہ دوسروں کے لئے اس میں نفع کا کچھ سامان ہو— جب کہ آپ بیتی رقم کرنے کے سلسلہ میں اپنے اس نظریہ کا اظہار متعدد مقامات پر کر چکا ہوں کہ اس کے لکھنے کا خیال اس شخص کو آ سکتا ہے جو اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے نمونہ سمجھتا ہو— ورنہ اپنی اپنی زندگی کے ایام تو سب ہی بسر کرتے ہیں، پھر ہر ایک کو اپنے احوال زندگی یا سرگذشت حیات لکھنے کا خیال کیوں نہیں آتا؟ میں نے اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ ''آپ بیتی'' قلم بند کرنے کا جواز مجھے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ''آپ بیتی'' سے ملا، جسے پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اپنے قلم سے اپنی سرگذشت کے کمزور پہلوؤں کو جس طرح خود ''آپ بیتی'' رقم کرنے والا لکھ سکتا ہے، دوسرا نہیں لکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ کسی دوسرے کی سوانح لکھنے والے کے ذہن میں صاحب سوانح کی عقیدت ومحبت پہلے سے موجود ہوتی ہے، اور یہ سامنے کی بات ہے کہ **حبك الشیئ یعمی و یصم** (کسی شی (یا فرد) کی محبت تمہیں اندھا بہرا بنا دیتی ہے) پھر ایک مسلم سوانح نگار کے پیش نظر یہ نبوی ہدایت بھی ہوتی ہے کہ **اذکروا**

محاسن موتاکم (یعنی تم اپنے مرجانے والوں کی خوبیوں کا ذکر کیا کرو— خامیوں کا نہیں)۔

پیش نظر کتاب ''نہ ہی مکمل آپ بیتی'' ہے نہ اس میں ''آپ بیتی'' کے تمام اصولوں کی رعایت ہے—— یہ تو بس اپنی سات دہائی سے اوپر کی زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کا ایک غیر منظم بیان ہے، اور اس کا سلسلہ بھی بڑے عجیب وغریب انداز میں غیر ارادی طور پر شروع ہو گیا۔ اس کا پس منظر سمجھنے کے لئے چند برس پہلے کی طرف جانا ہوگا۔ ہوا یوں کہ میں اپنے خردوں خصوصاً گھر کے بچوں کی دل بستگی کے لئے کبھی کبھار موقع ملنے پر اپنے دلچسپ تجربات خصوصاً اسفار میں پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتا، جس کا مقصد تفریح طبع کے ساتھ ہی کچھ سیکھنا سکھانا ہوتا تھا۔ ان واقعات کو سن کر بار بار سننے والوں نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ان کو قلم بند کر دیجئے۔ تاکہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہو جائے۔ اس طرح اس کا نفع عام ہونے کی توقع ہے۔ پہلے لمبے عرصے تک میں یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ یہ منتشر واقعات تو بس تم لوگوں کی دلچسپی کے لئے سنا دیتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ تم لوگ جس طرح ان سے محظوظ ہوتے ہو، دوسرے بھی اسی طرح محظوظ ہوں— مگر جب اصرار بہت بڑھا تو اپنے دیگر مشاغل کے ساتھ موقع بہ موقع ایسے جو واقعات یاد آتے گئے، تقدیم وتاخیر کی رعایت کے بغیر لکھتا گیا۔ ایک معتدبہ عرصہ میں جب اچھے خاصے واقعات جمع ہو گئے اور میں نے ان پر نظر ثانی کی تو مجھے خود بھی لگا کہ اس میں ہر فکر ونظر والے کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان تو ہوگا ہی، چنانچہ میں نے انہیں سنجیدگی کے ساتھ ایک خاص ترتیب اور حذف و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کیا، اور پھر ''یادوں کے جھروکوں سے'' نام سے اس کتاب کی اشاعت ہوئی۔ اس کی رسم اجراء کے لئے جو تقریب ہوئی،

اس میں علماء، ادباء اور دانشوروں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اور جن لوگوں نے پہلے سے کتاب پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، ان سبھی نے میری امید وتوقع سے بڑھ کر کتاب میں درج واقعات اور اسلوب نگارش کو اس طرح سراہا کہ مجھے یقین کرنا پڑا کہ واقعی کچھ اچھا کام ہوگیا ہے۔

کتاب پڑھ کر بعض احباب نے اپنی اس تشنگی کا اظہار کیا کہ کسی سفر یا کسی دوسری مناسبت سے آپ نے جس متعلقہ حصہ کا انتخاب کیا، وہ تو دلچسپ ہے ہی، لیکن اس سفر یا مناسبت کی پوری تفصیل بھی آپ ہی کے قلم سے آجاتی تو ممکن ہے کہ کچھ اور ایسے گوشے سامنے آتے کہ قارئین کو کچھ مسکرانے، کچھ عبرت حاصل کرنے، اور کچھ مستقبل کی تعمیر کے مواقع مل جاتے۔

اس توجہ دہانی کو کچھ مفید پاکر ایک مرتبہ پھر اپنی یادداشتوں کے سہارے بچپن سے تادم تحریر یادرہ جانے والے احوال کو نئی ترتیب سے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، جسے آپ آدھی ادھوری ''آپ بیتی'' بھی قرار دے سکتے ہیں۔ چوں کہ ڈائری یا روزنامچہ لکھنے کا میرا کبھی معمول نہیں رہا، اس لئے اس تحریر میں نہ تاریخی ترتیب کی رعایت ہوسکی نہ ہی تمام قابل ذکر واقعات وشخصیات کو ضبط تحریر میں لاسکا۔ اسی بنا پر میں نے اس تحریری مواد کو کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے اس کتاب کا نام ''کچھ یادرہا کچھ بھول گیا'' تجویز کیا ہے۔ تاکہ میرا کوئی محب وخیر خواہ اپنے سے متعلق کسی قابل ذکر واقعہ کو اس کتاب میں نہ پاکر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو، اور وہ یہ سمجھ کر کہ دانستہ طور پر یہ نہیں ہوا ہے بلکہ بھول جانے کی وجہ سے ہوا ہے ''کچھ بھول گیا'' کے خانہ میں ڈال دے۔

کتاب کیسی ثابت ہوگی، قارئین کی طرف سے اسے پذیرائی حاصل ہوگی یا ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائے گی؟۔ اس کا فیصلہ کتاب کی اشاعت اور اس

کے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچنے کے بعد ہی ہوسکے گا — اور اشاعت کب ہوسکے گی؟ اس کے بارے میں بھی کچھ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس تحریری مواد کو ابھی کئی مرحلوں سے گذرنا ہے۔

میں بے حد شکر گذار ہوں اپنے خصوصی کرم فرما حضرت مولانا محمد زکریا سنبھلی صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور برادر کبیر، عظیم صحافی و ادیب احمد ابراہیم علوی صاحب کا کہ ان دونوں حضرات نے میری درخواست پر میری اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کو لائق اعتنا گردانتے ہوئے اپنی پرمغز تقریظوں و تعارفی کلمات کے ذریعہ کتاب کی قدر وقیمت میں اضافہ کیا۔

آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ پروردگار عالم محض اپنے کرم سے اس کتاب کے مندرجات کو قارئین کے لئے مفید بنادے، اور میری بے کیف زندگی اور اس کے ادھر اُدھر کے واقعات سے اللہ کے کچھ نیک دل بندوں کو کچھ ایسا مل جائے کہ بے ساختہ میری حسن عاقبت کے لئے ان کی زبان سے دعائیں نکل جائیں۔ بس یہی کہتے ہوئے رخصت ہو رہا ہوں کہ ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم وبیش را

فقط والسلام

عبدالعلی فاروقی
ابراہیم منزل، پاٹانالہ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۳
۱۱/شوال ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۱/اپریل ۲۰۲۴ء

تقریظ معتبر

از قلم: حضرت مولانا **محمد زکریا** سنبھلی صاحب،
شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زیر نظر کتاب ''کچھ یاد رہا —— کچھ بھول گیا'' جناب مولانا عبد العلی فاروقی لکھنوی کی تصنیف ہے، مولانا عالم دین ہونے کے ساتھ مقرر، صحافی، صاحب قلم بھی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے بالکل بچپن کی طالب علمی یعنی حفظ قرآن، ابتدائی درسی کتب کی تعلیم، پھر گھر سے باہر دیگر مدرسوں میں تعلیم کے لئے جانا جن میں سب سے پہلے بہرائچ کے مشہور مدرسہ نور العلوم اور اس کے اساتذہ کا ذکر ہے اور وہاں کے قواعد وضوابط اور مدرسہ کے ماحول کا ذکر ہے۔ میں بھی اس مدرسہ میں پڑھ چکا ہوں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں کہ ان چیزوں کے بیان میں کچھ کمی رہ گئی ہے اور مدرسہ کا جو امتیازی ماحول اور مدارس میں اس کا مقام ہے اس کا حق ادا نہ ہو سکا، میری تعلیم میں زیادہ حصہ تو دار العلوم دیوبند ہی کا ہے لیکن طالب علمی نور العلوم اور وہاں کے اساتذہ نے ہی سکھائی ہے۔ نظم وضبط کا ذکر کیا اور خوب

کیا، لیکن اس میں یہ کمی رہ گئی کہ طالب علم اپنی مرضی سے نہ ضروریات کے لئے باہر جا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے جامع مسجد کے علاوہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ مدرسہ کی حفاظت کے خیال سے جو تین طالب علم جماعت کے ساتھ مدرسہ میں نماز پڑھ سکتے تھے ان میں بھی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تھا۔ با جماعت نماز کی پابندی ایسی تھی کہ ایک رکعت بھی چھوٹ جانا موجب سزا ہوتا تھا —— خاص مواقع پر بھی صرف طلبہ کو اساتذہ کے گھر جا کر خدمت کرنے یا کھانا کھانے کی اجازت نگراں سے لینی پڑتی تھی۔ مدرسہ میں ایک طلبہ کی لائبریری تھی وہ بھی پہلے سے چلے آ رہے نظام الاوقات اور قواعد کی پابند تھی اور ان قواعد وضوابط میں سر مو اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ طلبہ کی تربیت میں جو قربانیاں وہاں کے نگراں دیتے تھے وہ بے مثال تھیں —— طلبہ کے مستقبل پر ان کا بہت اثر پڑتا تھا۔

وہاں کے عام اساتذہ قلیل تنخواہوں پر گذارہ کرتے تھے۔ کھانا بھی مدرسہ کے مطبخ کے کھانے سے کم درجہ کا ہوتا تھا۔ اساتذہ کے کپڑے بھی اوسط درجہ سے کم درجہ کے ہوتے تھے۔ لیکن مدرسہ میں صاف شفاف کپڑوں میں ہی آتے تھے۔ طلبہ کے معاملہ میں نہایت شفیق اور عادل تھے کسی پر زیادتی نہ کسی پر بھی رعایت کی گنجائش تھی۔ میں مولانا کی تصنیف پر کچھ لکھنے بیٹھا تھا لیکن اسی حکایت لطیف میں ایسا گم ہو گیا کہ قلم بے ساختہ چلتا ہی چلا گیا۔ حق تو نور العلوم کا اس سے بہت زیادہ ہے۔

مولانا نے دار العلوم دیوبند کے اساتذہ کے بارے میں جو کچھ لکھا

بہت ہونے کے باوجود بہت کم ہے پھر وہاں کی تعلیمی اور روحانی فضا کا تو ذکر ہی کیا، جنہوں نے دیکھا نہیں ان کے لئے سمجھنا مشکل ہے۔

میرے والد صاحب مرحوم بعض اوقات مجھے تنبیہ فرماتے ہوئے کہا کرتے تھے ذہین تم زیادہ ہو لیکن تجربہ ہمیں زیادہ ہے۔ مولانا کی ایم-اے کی ڈگریاں بھی ان کے والد صاحبؒ کے لکھنوی اور عالمانہ انداز تربیت کے آب جو میں اسی طرح بہ گئیں۔ واقعہ یہ ہے جسے بھی خدمت دین کا کچھ مزہ لگ جاتا ہے اس کا ذہن و دماغ بلکہ مزاج اسی طرح بن جاتا ہے۔

ان دونوں مدرسوں میں گذارے ہوئے دنوں کے بعد اپنے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کی خدمت کا ذکر ہے اور بعض امتحانات کا بھی تذکرہ ہے جن میں الحمدللہ مولانا کامیاب رہے۔

مولانا نے اپنے والد صاحبؒ کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم فاروقیہ کا تذکرہ بڑے مزے کے ساتھ کیا ہے اس مزے اور لذت کو باغباں ہی سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی لذت اس باغ پر پھل آتے دیکھ کر حاصل ہونے والی لذت کے برابر نہیں ہوسکتی۔

مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کے ضمن میں مدرسہ کے ترجمان ''البدر'' کے اجراء اور اس کے متعلق بہت سی باتیں بھی ذکر میں آ گئی ہیں۔

لکھنؤ کے بڑے خاندان سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بعض بڑے سرکاری یا نیم سرکاری عہدوں تک پہنچ سکنے کے باوجود ان سے بچے رہنے کی داستان بھی موجود ہے جو دوسروں کے لئے نصیحت کی چیز ہے۔

کتاب میں اپنے مرحوم دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی وفات کا بھی ذکر ہے۔ خصوصاً مرحوم والدین کا تذکرہ بھی ہے۔ کتاب میں نوجوانوں خصوصاً دینی طلبۂ علم کے لئے بھی بعض بہت کارآمد باتیں ذکر کی گئی ہیں۔

کتاب کے آخر میں کچھ خردوں، کچھ بزرگوں کے حالات اور اپنے بچپن کے تبلیغی اسفار کا تذکرہ ہے اسی کے ضمن میں پالن حقانی صاحب کا تذکرہ بھی ہے۔

میں کوئی صاحب قلم نہیں لیکن مولانا کے فرمانے پر کچھ سپرد قلم کردیا ہے اس میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔

محمد زکریا سنبھلی

ایک میاں پوت ادیب

ازقلم: محترم احمد ابراہیم علوی صاحب

سچ بولنے کی تلقین اور تاکید برابر ہوتی رہتی ہے لیکن عمل کتنا ہوتا ہے کون کرتا ہے اس پر غور کیا جائے تو افسوس ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ بولنا جتنا آسان اور اچھا ہوتا ہے سچ بولنا اتنا ہی مشکل اور اکثر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بظاہر فائدہ بھی نہیں نظر آتا ہے لیکن سچ بولنے کی تلقین سے گریز کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے یہ مطالبہ کبھی کا ہوتا ہے کہ وہ سچائی سے کام لیں، مگر وہ سچ لکھنے لگیں تو کتنے ہم نوا ہوں گے!۔ اس پر غور کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔اسی لئے چٹ پٹی خبریں اور جھوٹی تحریریں بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔اس تلخ حقیقت کی تردید آخر کیسے کی جائے؟ ایسا اس لئے ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ادیب یا صحافی نے ایمانداری سے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ جھوٹ کو سچ پر ترجیح دینے سے گریز ہی کامیابی کی دلیل سمجھی جائے۔

انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ دوسروں کی خرابیاں اور برائیاں سننے اور جاننے کے لئے بے قرار رہتا ہے اس سلسلے میں جو کچھ مل جاتا ہے اسی سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔اچھائیوں کی فکر ہی نہیں کرتا ہے۔

بڑے لوگوں کی اچھائیاں بیان کرنے کے لئے مضامین لکھے جاتے ہیں تاکہ لوگ پڑھ کر اچھا بننے کی کوشش کریں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اچھائیاں بیان کرنے والے مضامین میں بھی برائیاں تلاش کر کے انہیں کو خوب خوب بیان کیا جاتا ہے۔

مختلف شعبہ ہائے حیات میں بہت کچھ کر کے کامیابی اور شہرت و عزت حاصل کرنے والے لوگوں پر خوب خوب لکھا جاتا ہے ان کی سوانح حیات کا بڑا ذکر ہوتا ہے تو بعض بڑے فنکاروں نے اپنے بارے میں خود بہت کچھ بلکہ سب کچھ لکھ کر یہی کوشش کی ہے کہ ان کے اچھے کاموں کو سمجھا جائے سراہا جائے۔بعض عظیم شخصیتیں اس کاوش میں کسی حد تک کامیاب رہی ہیں۔اس لئے بہت کچھ لکھنے اور سچ لکھنے کی تلقین کے ساتھ کوششیں ہمیشہ سے جاری ہیں اور جاری رہیں گی۔اچھی سوانح اور خودنوشت سوانح کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں لیکن صرف سچ لکھا جائے تو کیسے مزہ آئے گا؟

جیمس باسویل نے ڈاکٹر جانسن کی سوانح حیات لکھی تو اس کو اس لئے بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا کہ جانسن سے متعلق یہ حقیقت عریاں ہوئی کہ انہوں نے اپنی عمر سے دوگنی عمر کی اس خاتون سے شادی کی جو کہ اس کی استانی تھی ان سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہوا ان کا جواب تھا کہ یہ دوطرفہ عشق

کا معاملہ تھا۔ یہ جھوٹ نہیں سچ تھا۔لیکن اس سے مترشح ہو گیا کہ اس سوانحی تحریر میں اور بھی کیسی کیسی اور کتنی دلچسپ باتیں ہوں گی اس لئے یہ کتاب آج بھی بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ جوش کو جو چاہے جو کہہ لے مگر اس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے خودنوشت میں جو کچھ لکھا وہ انتہائی دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مولانا عبدالعلی فاروقی انتہائی معصوم انسان ہیں شاید اسی لئے بڑی کوشش کرتے ہیں کہ سچ لکھیں مگر بہکنا تو پڑتا ہی ہے انہوں نے اپنی سوانح بڑی سادگی اور ایمانداری سے لکھنے کی کوشش کی مگر بڑی چالاکی سے وہ سب لکھنے سے گریز کر گئے جو لکھنا ضروری تھا اور جس کو پڑھ کر کوئی سمجھ سکتا کہ وہ اچھے اور سچے انسان ہونے کے علاوہ عام انسان بھی ہیں۔ انہیں بھی وہ سب کچھ اچھا لگتا ہے جو کہ عام انسان اچھا سمجھتا ہے جب بھی کوئی ایسا موقع آیا کہ کچھ یقین سا ہو کہ اب مولانا ہمارے جیسے عام آدمی بن کر سامنے آئیں گے انہوں نے کوئی خوبصورت جملہ لکھ کر اچھا بہانہ تلاش کر کے راستہ بدل دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جتنے شریف نفیس اور بااخلاق ہیں ان کی تحریر اس سے بھی زیادہ نفیس اور پرکشش ہے بڑے سلیقے سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات کہہ کر آگے بڑھنے کا انداز ان کی شخصیت کو مزید اور پرکشش بنانے کا باعث رہتا ہے۔

آسان سے آسان زبان میں لکھنا مولانا کی خصوصیت ہے ان کی

دلنشینی اور پرخلوص شخصیت ان کی تحریر میں غالب نظر آتی ہے۔

مولانا نے یہ بڑا غضب کیا کہ سب کچھ لکھ کر بھی وہ نہ لکھا۔ جس سے ہم ان کو اپنا جیسا عام آدمی سمجھ سکیں بس یہی بات ہم کو ان سے دور کر دیتی ہے۔ ہم کیسے یقین کریں کہ مولانا کبھی بہکے ہی نہیں؟ پردہ نشین شریف بہو بیٹیوں کی طرح گھر میں رہے اور اس چہار دیواری سے باہر کبھی قدم ہی نہیں نکالا۔ حد یہ ہے کہ وہ اپنی پسند تک کا اظہار کرنے سے گریزاں ہی رہے۔ بڑے نیک، شریف، مہذب پرخلوص ایمان دار ہی رہے۔ عشق کی منزل تو وہ ہے جہاں بڑے بڑے بہک کر بڑوں بڑوں کو بہکا دیتے ہیں تب جا کر غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ توبہ کی جاتی ہے توبہ ہوتی ہے تب ایک عام آدمی انسان بن کر نمایاں ہوتا ہے تو قابل رشک ہوتا ہے۔ مولانا نے بغیر بہکے قابل رشک بن کر ہم جیسے شیطان صفت لوگوں کو پریشان کیا ہے۔ ہم مجبوراً تعریف کر رہے ہیں۔ واقعی مولانا کی تحریر پرکشش دل نشین قابل تحسین ہے۔

مولانا عبدالعلی فاروقی نے اپنی مختصر سوانحی تحریر میں اس بات کو دل نشیں کرنے کی کوشش کی ہے کہ سچ ہی باقی رہنے والا ہے۔ لوگ دلچسپی سے پڑھیں آسانی سے پڑھیں اس کے لئے انہوں نے عنوانات قائم کر دیئے ہیں جملے چھوٹے ہوتے ہیں تو پیراگراف بھی طول طویل نہیں۔ پڑھنے والے کی دلچسپی بہرحال برقرار رہتی ہے۔ جو کامیابی کی دلیل ہے۔

''میری کارگاہِ رنگا رنگ ——— دارالعلوم فاروقیہ''، ''جاری ہے زندگی کا سفر''، ''کیا یاد رہا ——— ایک مثال''، ''ایک طلسماتی شخصیت ——— مولانا

پالن حقانی‘‘، ایسے عنوانات قائم کرکے مولانا علی صاحب نے قارئین کو باندھے رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نفسیاتی مطالعات سے بھی مستفید ہونے کی فکر رکھتے ہیں۔انہوں نے جگہ جگہ پر برمحل اشعار کا استعمال کیا ہے لیکن اشعار وہی استعمال کئے ہیں جو کہ عام فہم اور زباں زد رہتے ہیں تاکہ قاری کو کسی قسم کی الجھن نہ رہے جب کہ ہمارے بیشتر کامیاب ادیب بھی ان باریکیوں پر نظر نہیں رکھتے جو اکثر ناکامی کی وجہ بن جاتی ہے۔

مولانا عبدالعلی فاروقی صاحب نے مولانا حقانی کے بارے میں بہت کچھ لکھ کر جو خدمت انجام دی ہے اس کی اہمیت تو شاید خود انہیں بھی نہ ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل یہی تحریر باعث تحسین ہو کر رہے گی۔ہم اردو والے بڑے لوگوں کی طرف لپکتے ہیں، ممتاز اور مقبول و مشہور شخصیتوں پر لکھنا بڑا اچھا سمجھتے ہیں جب کہ اس سلسلے میں لکھی گئی باتیں خاص نہیں ہوتی ہیں، اکثر میں تکرار ہوتی ہے ایک ہی طرح کی باتیں سبھی لکھتے ہیں مگر ہم عام آدمیوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔جنہوں نے نظیرؔ کو نظر انداز کیا آج وہی تسلیم کر رہے ہیں کہ برسوں پہلے وہ جو کچھ کہہ گیا وہ ہم بڑی کاوش کے باوجود نہیں کہہ پا رہے ہیں۔عام آدمی کی تلاش کر کے اس کی خاص باتوں پر توجہ کرنا ہی اہم اور ناقابل فراموش کام ہوتا ہے۔مولانا عبدالعلی فاروقی نے مولانا پالن حقانی پر رواروی میں جو کچھ لکھ دیا کل اسی کو سراہا جائے گا۔تلاش ہوگی کہ ایسے لوگ اور کہاں ہیں اور کیسے مل سکتے ہیں تاکہ ہم بھی بہت عام ہو کر بڑے خاص بن

سکیں۔

مولانا عبدالعلی فاروقی اسی ایمان داری، خلوص، للّٰہیت اور دلچسپی سے لکھتے رہیں گے تو ان کو نظر انداز کر دینا آسان نہ ہوگا۔انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے اور جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر مبارک باد نہ پیش کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔

احمد ابراہیم علوی

۲۵/مارچ ۲۰۲۴ء

بوقت ۴/بجے دن

میری کارگاہِ رنگارنگ —— دارالعلوم فاروقیہ

شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے جیسے تیسے دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ''فاضل دیوبند'' کا اعزاز حاصل کرنے کا مستحق بن کر جب واپس آیا، تو ضمیر نے یہ فیصلہ تو کر دیا تھا کہ مجھے ''مولوی'' بن کر ہی رہنا ہے — مگر ''دنیا طلبی'' کا کیڑا ابھی پوری توانائی کے ساتھ زندہ تھا۔ اور تصور ہی تصور میں دارالعلوم دیوبند کے معزز رکن شوریٰ نیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے معزز و باوقار استاذ، ندوۃ المصنفین دہلی کے شریک بانی اور اس کے ترجمان ماہنامہ ''برہان'' کے مدیر عالی وقار حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کو ''آئیڈیل'' مان کر یہ سوچا کرتا تھا کہ جب وہ اپنے پورے عالمانہ وقار اور عالمانہ وضع قطع کے ساتھ ملک کی ایک عظیم یونیورسٹی کے استاذ رہتے ہوئے اور اس کے ذریعہ بڑی (اور ایک مدرسہ کے استاذ کے لئے ناقابل تصور) تنخواہ حاصل کرتے ہوئے دینی حلقوں کیلئے قابل احترام شخصیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد اہم دینی کتابوں کے مصنف، اور بہترین خطیب ہو کر دونوں حلقوں کیلئے نہ صرف قابل قبول، بلکہ لائق

اعزاز و احترام ہو سکتے ہیں تو ''ان کی ڈگر'' پر چل کر میں یہ سب کچھ کیوں نہیں حاصل کر سکتا؟۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے فوراً بعد اگرچہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قائم کئے ہوئے نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری، لکھنو میں میرا تقرر اس وقت کے مروجہ معمولی مشاہرہ پر کر دیا تھا، اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ خدمت دین سے زیادہ اپنے مشفق و مہربان والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دینے، اور مدرسہ کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں لگ گیا تھا — مگر اسی کے ساتھ ساتھ ''اپنے منصوبہ'' کے مطابق پرائیویٹ اور ریگولر دونوں طریقوں سے عصری تعلیم کی اتنی ڈگریاں جمع کرنے کی طرف بھی متوجہ رہا کہ جن کے ذریعہ اپنے منصوبہ و خیال کے مطابق ''بڑا آدمی'' بن سکوں؟۔

اس مرحلہ میں اتنی بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ جیسا بڑا آدمی بننے کا خیال تو بہت بعد میں، کچھ ''باشعور'' ہونے پر، دارالعلوم کے سہ سالہ دور طالب علمی میں کچھ انہیں دیکھ کر اور کچھ انہیں پڑھ کر آیا تھا — لیکن میرے دماغ میں یہ کیڑا کہ ''مولویانہ زندگی اختیار کر کے دنیا میں بڑا آدمی نہیں بنا جا سکتا ہے'' بہت بچپن اور کمسنی ہی سے پرورش پا رہا تھا۔ چنانچہ دس برس کی عمر کے اندر ہی حفظ قرآن، اور تجوید بروایۃ حفصؒ کی تکمیل تو ذوق و شوق کے ساتھ اس لئے کر لی تھی کہ اول تو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے کی عمر نہ تھی، اور اس سے بڑھ کر اس وجہ سے کہ

میرے مدرسہ تجوید الفرقان میں میرے گھر گھرانے کا کوئی اثر و دخل نہ تھا، اور گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر تک اپنے اساتذہ کی ہدایات اور ان کے احکام پر عمل کرنے پر مجبور تھا؟ — لیکن اس کے بعد جب اپنے گھر گھرانے کی عملداری کے مدرسہ دارالمبلغین کے شعبہ درس نظامی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوا تو شیطان کو میرے ناپختہ ذہن و شعور پر اپنی حکم رانی قائم کرنے کا بھرپور موقع مل گیا۔ چنانچہ یہاں رہ کر متوسطات یعنی شرح جامی وغیرہ کی جماعت تک اس طرح پڑھائی کی کہ بس اسباق میں حاضری کی پابندی کے سوا ہر پابندی سے آزاد رہا۔ نہ سبق یاد کرنے، اسے دوہرانے، یا اگلے سبق کیلئے مطالعہ کرنے کی طرف کوئی توجہ، نہ ہی اس بات کی طرف کوئی دھیان کہ ''پڑھائی کی اس جبری رسم'' کو انجام دے کر ہم کیا بنیں گے اور ہمیں اس سے کیا ملے گا؟۔ کیوں کہ ذہن میں تو یہ ''فاسد خیال'' دھیرے دھیرے راسخ ہوتا جارہا تھا کہ اس ''موروثی تعلیم'' سے جیسے تیسے فراغت کے بعد ''اصل تعلیم'' تو بعد میں حاصل کرنا ہے، اور اسی کی طرف پوری توجہ مبذول کروں گا؟۔ اس دوران اپنی بڑی بہن کے طفیل میں ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کے ذریعہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تو اس میں بھرپور دلچسپی لے کر اس وقت کے اسکولی نصاب میں داخل بہت معیاری کتاب Today and Tomorrow Reader کے کئی حصے بھی پڑھ لئے، اور انگریزی لکھنے پڑھنے کی بھی کچھ صلاحیت حاصل کر لی۔

زندگی کا انقلابی موڑ: پھر یہ ہوا کہ قسمت نے یاوری کی،

اور والد صاحب نے میری برباد ہوتی زندگی اور تعلیم کی طرف سے فکر مند ہو کر مجھے اپنے سے جدا کر کے باہر بھیجنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مشرقی اتر پردیش کی اس وقت کی سب سے ممتاز و معیاری تعلیم و تربیت گاہ جامعہ مسعودیہ نورالعلوم بہرائچ میں داخل کرا دیا۔ اگرچہ والدین کریمین نے اپنے سینوں پر پتھر رکھ کر میرا مستقبل سنوارنے کے لئے مجھے اپنے سے جدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا— لیکن ان کا یہ مبارک فیصلہ میرے لئے اس حد تک تو انقلابی ثابت ہوا کہ نورالعلوم کی تعلیم و تعلم سے بھرپور فضا نے میرے اندر بھی یہ تبدیلی پیدا کر دی کہ عمر کو برباد نہیں کرنا چاہئے اور جو تعلیم اس وقت حاصل کر رہے ہیں اس میں بھی دلچسپی لینا چاہئے اور اپنی جماعت و دیگر طلبہ کے درمیان مجھے بدشوق و لایعنی طالب علم بن کر نہیں رہنا چاہئے— پھر ایک حادثہ ایسا پیش آیا کہ اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا؟۔ ہوا یہ کہ ایک دن دوران درس میرے استاذ محترم حضرت مولانا سلامت اللہ بیگ صاحب صدرالمدرسین مدرسہ ہذا نے سبق شروع کراتے ہوئے مجھے کتاب ''مختصر المعانی'' کی عبارت پڑھنے کا حکم دے دیا۔ اس حکم کو سنتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی، اور میرا چہرہ فق ہو گیا۔ کیوں کہ مجھے اس وقت تک یہ بھی یاد نہ تھا کہ کسی جملہ کی ترکیب کیسے ہوتی ہے؟ جملہ خبریہ و جملہ انشائیہ میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جملہ اسمیہ خبریہ کا ترجمہ کیسے کیا جاتا ہے اور جملہ فعلیہ خبریہ کا کیسے؟ حتیٰ کہ جملوں کے اجزائے ترکیبی، مبتدا خبر، فعل فاعل اور مفعول وغیرہ کی بھی صحیح طور پر شناخت نہیں کر سکتا تھا—— پھر بھلا استاذ کے روبرو صحیح عبارت کیوں کر

پڑھ سکتا تھا؟ ——— اس پر مستزاد یہ کہ استاذ محترم بھاری جسم و جسامت، اور اپنی کڑک دار آواز کی وجہ سے اتنی بارعب شخصیت کے مالک تھے کہ طلبہ کا تو ذکر ہی کیا، بیشتر مدرسین (جن میں کے اکثر ان کے شاگرد تھے) بھی ان سے نگاہیں چار کر کے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ تو بھلا مجھ جیسا نو وارد و نو گرفتار طالب علم ان کے حکم سے سرتابی کرنے کی کیسے جرأت کر سکتا تھا؟۔ ''حکم حاکم مرگ مفاجات'' سمجھ کر ''مختصر المعانی'' جیسی مغلق اور فنی کتاب کی عبارت خوانی کی رسم انجام دینا شروع کی، جس کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم ہو پا رہا تھا کہ میرے منہ سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں؟۔ دوسری طرف ساتھی طلبہ کی معنی خیز مسکراہٹ اور بھی پانی پانی کئے دے رہی تھی —— یہ دھڑکا الگ لگا ہوا تھا کہ کس دم استاذ محترم کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے اور وہ اپنی گھن گرج کے ساتھ مجھ پر برس پڑیں۔ کشمکش، سراسیمگی اور شرمندگی و بدحواسی کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے —— اور بس یہی وہ مرحلہ تھا جب استاذ محترم نے اپنی دل سوزی اور حسن تربیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری لاابالی اور برباد ہوتی زندگی کا سمت سفر ہی بدل دیا۔ استاذ محترم نے ناراضگی و غصہ کا اظہار تو کیا، لیکن نہ مجھے جاہل و گنوار کہہ کر ڈانٹا ڈپٹا، نہ ہی مجھے خاندانی حوالوں سے شرمندہ کیا —— بلکہ انہوں نے تو میرے بجائے میرے ساتھی طلبہ پر اپنی برہمی کا اظہار کر کے ایک منجھے ہوئے استاذ و مربی کے روپ میں ''ایک تیر سے دو شکار'' کرتے ہوئے فرمایا:۔

''تم لوگ کیا ہنس رہے ہو، اپنے کو بہت قابل سمجھ رہے ہو، ابھی یہ نئے ہیں، پہلی مرتبہ گھر سے نکل کر پردیس آئے ہیں، تم سب سے کم عمر ہیں، جھجک ہے ڈر ہے، اجنبیت ہے۔ اس لئے عبارت پڑھنے میں لڑکھڑاہٹ ہے۔ تم ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتے ہو۔ جانتے ہو ان کی رگوں میں کون سا خون گردش کر رہا ہے؟ بس ذرا سی توجہ کی کمی ہے، انہیں ابھی کم عمری کی وجہ سے یہ احساس نہیں ہے کہ یہ کیا ہیں اور انہیں کیا بننا ہے۔ جس دن ان کی اس طرف توجہ ہوگئی اسی دن سے یہ اس طرح سرپٹ دوڑیں گے کہ تم انہیں دیکھتے رہ جاؤ گے۔ ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ تم فخر کے ساتھ لوگوں کے سامنے کہو گے کہ عبد العلی میرے ہم سبق ساتھی رہے ہیں۔ ایک علی میاں ندوی لکھنؤ میں ہیں جن کی عظمت کے سکّے ساری دنیا میں چل رہے ہیں۔ وہ سب کے ہیں —— اور ایک یہ میرے علی میاں ہیں جو ان شاء اللہ اسی طرح چمکیں گے جیسے علی میاں ندوی چمک رہے ہیں۔ خبردار! خاک کو خاک نہ سمجھو، خاک اڑ کر آنکھ میں پہنچتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ''

استاذ محترم کے اس نرالے انداز فہمائش و تربیت نے لمحوں میں مجھے ایک ''نئی دنیا'' میں پہنچا دیا۔ اور پھر آن کی آن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اپنے اتنے پیارے استاذ کی توقعات کو پورا کرنے کے لئے جد و جہد کرنا ہے۔

نورالعلوم کے پڑھنے، کھانے، سونے جاگنے کے سلسلہ میں منظم قوانین کے ہوتے، کسی طالب علم کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ۲۴ رگھنٹوں میں اپنی طرف سے بھی کچھ کر سکے؟ وہاں کا ماحول اور نظام یہ تھا کہ جس طرح پڑھائی کے وقت میں پڑھنے کے سوا طالب علم کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا تھا، اسی طرح آرام کے وقت میں آرام ہی کرنا تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔ رات میں عشاء کی نماز کے بعد لگ بھگ ایک گھنٹہ طلبہ کو مطالعہ وتکرار میں مشغول رہنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد سونے اور آرام کرنے کے لئے گھنٹی بج جاتی تھی۔ اور ہر طالب علم پر لازم تھا کہ اس کے بعد ۱۵ رمنٹ کے اندر اندر اپنے کمرہ میں پہنچ کر اپنا بستر اور ضروری سامان درست کر کے کمرہ کی لائٹ بند کر کے خاموشی کے ساتھ اپنے بستر میں نیند آنے کے انتظار میں لیٹا رہے — ایسا اس لئے تھا کہ صبح نماز فجر سے ایک گھنٹہ قبل ہی طلبہ کو اٹھ کر اجتماعی طور پر مسنون دعائیں پڑھنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر باجماعت نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد پہنچنا ہوتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ وہاں کے ۲۴ رگھنٹے کے نظام میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ کوئی طالب علم اپنے طور پر پڑھائی کے لئے بھی کچھ وقت نکال سکے، جب کہ میرا اپنا معاملہ یہ تھا کہ اگر میں اضافی محنت نہ کرتا تو اپنے درسی ساتھیوں کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، ان سے فائق وممتاز ہونے کی بات تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

طلبہ کے سخت گیر نگراں مولانا کلیم اللہ نوریؒ کی طلبہ کی ایک ایک نقل و

حرکت پر نظر رہتی۔ حتیٰ کہ رات کو سونے اور آرام کرنے کا وقت آنے کے بعد وہ کمرہ کمرہ پہنچ کر ایک ایک طالب علم کی نگرانی کرتے، اور اگر کہیں کسی طالب علم کو بات چیت کرتے یا کسی دوسری مشغولیت میں پاتے تو مناسب تنبیہ کر کے لیٹ کر سونے پر مجبور کرتے۔

ایسے حالات میں میں نے اپنا مقدمہ اپنے نگراں کے سامنے ہی رکھ کر ان سے مدد طلب کرنا مناسب سمجھا۔ نگراں صاحب نے میری پوری بات سن کر یہ اندازہ کرتے ہوئے کہ میری طلب واقعی سچی ہے، مجھے رات کو بستر وغیرہ درست کرنے کے بعد ایک گھنٹہ اس طرح پڑھنے کی اجازت دے دی کہ میں اپنے کمرہ کے باہر ایک ایسے مقام پر جہاں رات بھر روشنی رکھنے کا مدرسہ کی طرف سے انتظام تھا، اس طرح پڑھوں گا کہ کسی قسم کا شور وغل نہ ہو۔ اور پھر میں نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ”تلافی مافات“ کی اس طرح سنجیدہ کوشش کی کہ میں اپنے نگراں واساتذہ کی نظروں میں عزت کا مقام حاصل کرنے کے لائق ہو گیا۔ اس دوران میں اپنی دو درسی کتابوں ”مختصر المعانی“ اور ”مقامات حریری“ کے لفظ لفظ کو رٹنے اور سمجھنے کی کوشش میں اس طرح محو ہوتا کہ کئی مرتبہ میرے نگراں صاحب کو آکر مجھے سمجھانا پڑا، کہ بس اب رات بہت بیت گئی، کچھ دیر آرام کر لو۔ فجر کی نماز بھی جماعت سے ادا کرنا ہے۔

اب اسے کیوں کر فراموش کر سکتا ہوں کہ میرے اندر یہ خوشگوار تبدیلی میرے صرف ایک استاذ حضرت مولانا سلامت اللہ بیگ صاحب مرحوم کی

بے مثال فہمائش کے ذریعہ آئی تھی (جو اتفاق سے دارالعلوم دیوبند میں میرے والد ماجدؒ کے رفیق درس بھی رہے تھے۔ اور نورالعلوم میں میرے داخلہ کے وقت والد ماجدؒ نے مجھے ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را ☆ تو دانی حساب کم و بیش را

(جس کے جواب میں استاذ موصوف نے بس ان شاء اللہ کہا تھا)۔

نورالعلوم میں میری ان چند ماہ کی تعلیم و تربیت کا یہ فائدہ تو مجھے حاصل ہی ہوا کہ اس کے بعد تعلیمی سال ۸۸-۱۳۸۷ھ مطابق ۶۸-۱۹۶۷ء میں جب میرا داخلہ ایشیا کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں ہوا تو وہاں میرا شمار متوسط الاستعداد طالب علموں میں ہوا۔ جس میں بہ فضل خدا سال بہ سال ترقی ہوتی رہی۔ ان سب کے باوجود باقاعدہ عصری تعلیم حاصل کر کے اسے ذریعہ معاش بنانے کا میرا خواب جاگتا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے واپسی کے بعد اپنے مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری کی تدریسی و تنظیمی ذمہ داریوں سے وابستہ رہتے ہوئے میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ہائی اسکول سے لے کر لکھنؤ یونیورسٹی کے ایم-اے (اردو) اور ایم-اے (عربی) تک کا سفر ۱۹۸۶ء تک جاری رکھا۔ اس دوران کالج اور یونیورسٹی میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ میں نے خارج اوقات میں متعدد اساتذہ سے ٹیوشن بھی لئے، جس میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم پر خصوصی توجہ رہی۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں: پھر ایک ایسا ''خوش گوار حادثہ'' پیش آیا۔ یا یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ حق تعالیٰ کی خصوصی رحمت میری طرف اس طرح متوجہ ہوئی کہ میری زندگی کی سمت سفر ہی تبدیل ہوگئی۔ اور والد ماجدؒ کی سوز میں ڈوبی ہوئی ایک دعا نے مجھے معاشی ترقی کی فکر سے یکسر آزاد کر دیا — ہوا یہ کہ عصری علوم کی ضروری ڈگریاں امتیازی نمبرات کے ساتھ حاصل کر لینے کے بعد موقع ملنے پر میں نے ایک ڈگری کالج میں لیکچرار کی جگہ کے لئے درخواست دی، اور ضروری کارروائیوں کے بعد جب وہاں سے مجھے تقرری کا پروانہ مل گیا تو میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ واضح رہے کہ اس وقت مجھے مدرسہ سے ملنے والی تنخواہ اور کالج کی ابتدائی تنخواہ کے درمیان آٹھ گنے سے بھی زیادہ کا تفاوت تھا۔ پھر بھلا میں خوش کیوں نہ ہوتا کہ ''شامت اعمال'' سے اس وقت تک ذہن میں حصول تعلیم کا یہی مقصود تھا؟۔ والدہ ماجدہؒ کو تو کالج میں ملازمت کے لئے درخواست دینے سے لے کر تقرری کا پروانہ ملنے تک، تمام باتوں کی خبر تھی۔ لیکن والد ماجدؒ کو یہ سوچ کر کہ ''میری یہ بے وفائی'' یقیناً انہیں شاق ہوگی —— پھر پتہ نہیں کہ مجھے اپنے ارادہ میں کامیابی ملے یا نہ ملے؟۔ یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر قسمت نے یاوری کی اور میرا کالج میں تقرر ہو ہی گیا تو اکٹھا والد صاحب کے سامنے پوری بات رکھ کر ان سے اجازت طلب کرلوں گا۔ اور ان کی شفقت سے امید ہی نہیں، بلکہ یہ یقین تھا کہ وہ اپنی خواہشوں، چاہتوں، اور مجھ سے وابستہ اپنے خوابوں کو پس پشت ڈال کر مجھے خوش دیکھنے کے لئے اس ملازمت کی اجازت

دے ہی دیں گے۔ چاہے اس کی خاطر انہیں اپنے کلیجے پر کتنا ہی وزنی پتھر رکھنا پڑے؟ والدہ صاحبہ کو بہ تاکید منع کر دیا تھا کہ وہ والد صاحب کے سامنے میری اس نئی سرگرمی کے بارے میں کچھ نہ کہیں، ضرورت پڑی تو میں خود اسے مناسب طریقہ پر والد صاحب کے سامنے پیش کر دوں گا۔ (حالاں کہ میری یہ ایک بھول تھی کہ میری ان سرگرمیوں کی والد صاحب کو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ میری اور والدہ صاحبہ کی طرف سے اطلاع نہ دیئے جانے کے باوجود انہیں اتنی خبر تو بہ ہر حال ہو ہی گئی تھی کہ میں کالج کی نئی ملازمت کے لئے کوشاں ہوں)۔ بہر حال اپنے حساب سے یہ ''خوش خبری'' والد صاحب کو سناتے ہوئے جب میں نے ان سے اجازت طلب کی، تو مجھے ایسا لگا کہ وہ یہ خبر سننے کے لئے پہلے سے منتظر تھے۔ چنانچہ انہوں نے ''بہ ظاہر'' بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے مبارک باد اور کامیابیوں وخوش حالی کی دعا دینے کے بعد بس اتنا کہا—جاؤ بیٹے! اللہ تمہیں مبارک کرے، مگر میں نے یہ مدرسہ اس امید پر قائم کیا تھا کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آ کر اسے سنبھالو گے، میرا تو بڑھاپا اور پھر دارالمبلغین کی ایسی مصروفیات تھیں کہ میں اس نئے مدرسہ کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری امیدوں کے مطابق مدرسہ سے وابستہ ہو کر اسے آگے بڑھانے کے لئے ایسی جدوجہد کی کہ اتنی قلیل مدت میں اس مقام تک مدرسہ کے پہنچنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اپنی خواہش پر تمہاری خواہش کو میں ترجیح دیتا ہوں اور تمہاری ترقیات کے لئے رکاوٹ بننا

گوارہ نہیں کرتا ہوں۔ ہر باپ کی طرح میری بھی یہی چاہت ہے کہ میرا لائق بیٹا اپنی زندگی میں مجھ سے بڑھ کر کامیابیاں وکامرانیاں حاصل کرے—رہ گیا مدرسہ کا معاملہ، تو میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے اس کو دین اور دینی تعلیمات کے فروغ کے جذبہ سے قائم کیا تھا، اور اس کے ذریعہ دنیاوی منفعت نہ حاصل کی اور نہ اس کا کبھی تصور کیا—اب اگر اللہ کو منظور ہوگا تو وہ اس کی حفاظت اور فروغ کے لئے کوئی بندوبست کرے گا، ورنہ بند ہو جائے گا۔ مگر میں تمہاری ترقی کی راہ کا روڑا نہیں بنوں گا، میں خوشی خوشی تم کو نئی ملازمت قبول کرنے کی اجازت دیتا ہوں''۔

والد صاحب کی سوز میں ڈوبی اور بھرّائی ہوئی آواز میں دی گئی اس اجازت کا آج بھی تصور کر لیتا ہوں تو بیساختہ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں— مگر اسی کے ساتھ اپنے خالق ومالک کے اس بے پایاں کرم کا بھی شکر گذار ہوتا ہوں کہ والد صاحب کی اس پُر درد بات اور ان کی ''اصل چاہت'' کا حال جانتے ہی میں نے 'اپنے تمام منصوبوں'' کو پس پشت ڈالتے ہوئے والد صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود سپردگی کرنے میں ادنیٰ تاخیر نہیں کی، اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''ابو! میں کہیں نہیں جاؤں گا اور اسی مدرسہ میں رہ کر آپ کی خوشنودی کا سامان کرنے کی جدوجہد کروں گا۔ اللہ میرے عزم کو ثبات عطا کرے۔''

والد صاحب نے پہلے تو یہ خیال کر کے کہ ان کی گفتگو سے میرے ''جوانی کے جذبات'' کو ٹھیس لگ گئی ہے، میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے

پیار سے کہا نہیں بیٹے! تم میرے لئے ''اتنی بڑی قربانی'' دینے کی بات نہ سوچو، نہ ہی مجھے تمہارے اس اقدام سے کوئی قلق ہوگا۔ مدرسہ کی بات تو بس میں نے اس لئے کہہ دی کہ اب تو میری معذوریاں اور بھی بڑھ چکی ہیں، اس لئے میں اس کیطرف توجہ بھی نہیں دے سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ تمہاری طرح جذبہ ولگن کے ساتھ کام کرنے والا دوسرا کوئی تو مجھے آسانی کے ساتھ ابھی نہیں مل سکتا؟ لہٰذا میں نے اس کا مستقبل اسی کے سپرد کردیا جس کے نام پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

جواب میں میرے منھ سے جو الفاظ نکلے اسے میں ''تائیدِ غیبی'' اور اپنے رب کی خاص عنایت کے سوا اور کوئی تعبیر نہیں دے سکتا ہوں؟۔ میں نے کہا، ابو! آپ نے بڑے ایثار کے ساتھ مجھے دینی تعلیم دلوائی، اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ مجھ سے وابستہ آپ کی ''توقعات'' کیا ہیں، اور مجھے آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟——میں اگر پڑھ لکھ کر اپنی دنیا کمانے ہی میں لگ گیا، اور آپ جیسے شفیق و مہربان باپ کے جذبات کی کوئی پرواہ نہ کی تو میری زندگی کس کام کی؟۔ اور ''ایسی دنیا کمانے'' میں مجھے کس حد تک کامیابی مل سکے گی؟۔ اس لئے میرا یہ اٹل فیصلہ بغیر کسی دباؤ کے ہے کہ مجھے اب یہ مدرسہ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہئے۔ بس آپ کی دعا شامل حال رہی تو میں اس طرح ہی خوش اور مطمئن رہ سکوں گا۔

میرے منھ سے یہ الفاظ سنتے ہی والد صاحب انتہائی جذباتی ہوگئے تھے، اور پھر انہوں نے مجھے اپنے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کلیجے سے لگا کر جس

جس طرح کی دعائیں دیں، وہی میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ، اور مجھے اس زندگی میں جو کچھ بھی کامرانیاں نصیب ہوئیں ان کی شاہ کلید ہے۔ والد صاحب نے بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ

''جاؤ بیٹے! اگر تمہارا یہ حتمی فیصلہ ہے، تو ان شاء اللہ اس فیصلے پر تم کو کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ اور اس سے بڑھ کر تم کو اسی مدرسہ کی ملازمت اور وابستگی سے دے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہو''۔

قرآن وحدیث میں والدین کی اطاعت وفرماں برداری کرتے ہوئے ان کے سامنے ''سپر اندازی'' کرنے کا جس طرح تاکیدی حکم دیا گیا ہے، اور پھر اس کے جو فوائد وثمرات بیان کئے گئے ہیں اس پر ہمارا ایمان!—— لیکن عملی طور پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک چھوٹی سی خواہش (مگر نتائج وثمرات کے اعتبار سے بہت بڑی) پر اپنی خواہش کو پس پشت ڈال دینے کے جو فوائد مجھے اسی دنیا میں نظر آگئے، ان کی تفصیلات میں کیوں کر بیان کروں؟۔ میری تمام تر بے صلاحیتی کے باوجود میرے رب نے اسی ایک مدرسہ سے وابستہ رہتے ہوئے مجھے اپنے کرم سے اس طرح (قابل اطمینان حد تک پاک اور حلال طریقہ سے) نوازا کہ مجھے اپنی حصول یابیوں کو سمیٹنے سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا، اور ''کچھ کھونے'' کا احساس ہوتا۔ وَذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرے اپنے گھر گھرانے میں بھی، اور میرے بچپن

کے ہم جولیوں میں بھی، کئی ایسے افراد ہوئے جو اپنی اعلیٰ تعلیم اور باعزت عہدوں ومنصبوں کے اعتبار سے اس قابل رہے کہ مجھے ان پر رشک ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی ـــ مگر میں نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ نہ وہ میری طرح مطمئن وآسودہ رہے، نہ ہی اس لائق رہے کہ زندگی کے اس میدان میں کبھی ان کی ''حصول یابیاں'' میرے لئے باعث کشش ہوتیں۔ یا ان کے مقابلہ میں کبھی مجھے ادنیٰ درجہ کی ''محرومی'' کا احساس ہوتا؟ — تو پھر مجھے ان پر ''رشک'' کیوں آتا؟۔ بلکہ بہ فضل خداوندی ایسے کئی مواقع آئے کہ ایسے لوگوں نے مجھے ''للچائی نظروں'' سے دیکھا — جب کہ حقیقت یہی ہے کہ من آنم کہ من دانم۔

اللہ اللہ! کیا شان ہے ہمارے مالک بے نیاز کی، کسی ادنیٰ ترین اور گنہگار بندے کی بھی کوئی ادا اسے پسند آجائے تو وہ اس طرح اپنے انعامات و نوازشوں کی بارش کر دیتا ہے کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔

میرے ناقابل فراموش اساتذہ: دارالعلوم دیوبند میں حصول تعلیم کی سہ سالہ مدت کے دوران یوں تو ایک سے ایک باکمال وبافیض اساتذہ سے بہ قدر ظرف استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے۔ اور ان ''مشک بیز'' شخصیات نے پتھر کی لکیر کی طرح دل میں جگہ بنائی۔ جن میں اس وقت کے ناظم تعلیمات، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحبؒ، نائب مہتمم اور بے مثال منتظم حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، نائب صدر تعلیمات حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ، شیخ مسلم شریف حضرت مولانا

شریف الحسن صاحبؒ، شیخ ابوداؤد شریف حضرت مولانا عبدالاحد صاحبؒ، شیخ مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ، اور شیخ جلالین شریف حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ـــ لیکن کچھ ہمہ گیر شخصیت، کچھ فنی تفوق، اور کچھ افادہ کے عموم کی وجہ سے دارالعلوم کے دو استاذ میرے مرکز نگاہ وفکر بھی رہے، اور میرے لئے ''آئیڈیل'' بھی بنے۔ ان میں سے ایک شیخ الحدیث اور صدر تعلیمات حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ تھے جن کی بخاری شریف جیسی اہم اور ادق کتاب کی تدریس کا یہ نرالا و دل نشین انداز تھا کہ مجھ جیسا بے بساط وکم علم طالب علم بھی جب ان سے سبق پڑھ کر درس گاہ کے باہر آتا تو اکثر اپنے ساتھیوں سے کہتا کہ ''بلا وجہ لوگوں نے بخاری شریف کو ہوّا بنا رکھا ہے، اور اسے پڑھانے کے لئے علم حدیث میں دست رس کو ضروری قرار دیا جاتا ہے؟'' مجھے موقع دیا جائے تو میں اتنا شاندار درس دوں گا کہ لوگ اعتراف پر مجبور ہو جائیں گے'' ـــ میں آج بھی اپنے پچاس سال سے زائد کے تدریسی تجربہ کے باوجود از روئے قسم یہ کہہ سکتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ اگر واقعی مجھے اس وقت بخاری شریف کی تدریس وتشریح کا موقع مل جاتا تو جیسا اس وقت پڑھا لیتا، ویسا پچاس سال سے زائد کی رگڑ گھس کے بعد بھی آج ہرگز نہیں پڑھا سکتا ہوں ـــ قارئین کو اس کا بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ سب کچھ میرے شیخ بخاری کا کمال تھا کہ وہ اس طرح گھول کر پلا دیتے تھے کہ میرے جیسا ان کا ایک ادنیٰ شاگرد بھی ''اتنی بڑی بڑی ڈینگیں'' مارنے

کے لائق ہو جایا کرتا تھا۔ یعنی ؎

مستی کے لئے بوئے مئے تند ہے کافی
مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

میرے ''آئیڈیل'' بننے والے دوسرے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ تھے۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک، جتنے کامل استاذ، اتنے ہی اچھے مربی اور منتظم۔ اپنی بات کو سمجھانے اور دلوں میں اتار دینے کا ایسا قابل رشک سلیقہ جس کے لئے راقم الحروف کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ادیب، استاذ، مصنف، کاتب، خوش پوش، خوش مزاج، پرجوش، پرہوش، باوقار، باحیا --- کیا کچھ نہ تھے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ! عربی زبان وادب سے جنون کی حد تک عشق، پھر اپنے اس جنون کو طلبہ کے دلوں میں اتار دینے پر کامل دسترس --- اسی ''جنون'' نے ''القاموس الجدید، القاموس الاصطلاحی'' جیسی اہم اور عصری تقاضوں وضروریات کی تکمیل کرنے والی ڈکشنریاں تصنیف کرائیں۔ اردو وعربی دونوں زبانوں کی کتابت پر اتنی قدرت کہ اپنی تصنیف القاموس الجدید کے پہلے ایڈیشن کے عربی واردو دونوں زبانوں کے الفاظ کی خود ہی کتابت بھی کی، اور اسے شائع کرایا، عربی زبان کے مروج رسم الخط پر مہارت کی حد تک قدرت'' اور اسے اپنے طلبہ کو بھی سکھانے کا شوق، عربی تحریر ہی نہیں، تقریر پر ایسی قدرت کہ ایک مرتبہ برسبیل تذکرہ خود ہی فرمایا کہ مجھے اردو سے زیادہ عربی زبان میں تقریر کرنے میں سہولت ہوتی ہے،

کیوں کہ اس میں مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے الفاظ کے انتخاب میں کسی سوچ بچار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچھ کر گذرنے کا شوق ہی نہیں، اس میں ندرت پیدا کر کے دل آویز وپرکشش بنا دینے کا خداداد سلیقہ، جو صرف ان کی تحریروں وتقریروں ہی نہیں، بلکہ تدریسی انداز سے لے کر ان کے کمرہ میں بچھی ہوئی سفید وبراق بے شکن چادر، ان کے سفید کپڑوں اور ایک خاص وضع سے'' لگائی جانے والی دوپلی ٹوپی، اور رفتار وگفتار، ہر چیز سے عیاں ہوتا تھا۔ وہ جب اور جہاں ملتے تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی مہم کو سر کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ دار العلوم میں بہ حیثیت استاذ ادب عربی داخل ہوئے تو ایک دھوم مچا دی۔ طلبہ میں ایک پیاس جگا دی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے جسم ودماغ میں جو بجلیاں بھری ہوئی ہیں انہیں بہ عجلت تمام اپنے طلبہ میں منتقل کر دینا چاہتے ہیں۔ اپنی مادر علمی کے وقار وعزت کو بڑھانے اور اسے پوری اسلامی دنیا کے لئے ایک مثالی تعلیم وتربیت گاہ بنا دینے میں ایسے حریص کہ اپنے سے وابستہ ہر ہر طالب علم کو دار العلوم کا ایک سفیر، ایک منادی، اور ایک روشن ستارہ بنا ہوا دیکھنا چاہتے تھے --- یعنی وہ ایک فرد فرید جو ہمہ گیر تھا۔

عملی زندگی کا آغاز:

۱۹۷۰ء میں دار العلوم کی تعلیم سے جیسی تیسی فراغت کے بعد اسی سنہ کے آخری مہینے میں جب میری دار العلوم فاروقیہ کاکوری سے بہ حیثیت مدرس وانتظام کار وابستگی ہوئی، اس وقت اس مدرسہ میں میرے علاوہ درجات عربی

کے لئے ایک استاذ مولانا رفیق احمد قاسمی مرحوم (جو دارالعلوم دیوبند کے شیخ ثانی حضرت مولانا عبدالحق صاحب مرحوم کے خسر اور ان کی پہلی اہلیہ صاحبہ کے والد تھے) ایک سال پہلے سے موجود تھے اور ایک جماعت فارسی کے چند طلبہ کی، دوسری جماعت عربی اول کے چند طلبہ کی قائم تھی۔ قاری محمد حبیب الرحمن صاحب درجہ حفظ کے استاذ تھے۔ اور پرائمری درجات میں تین استاذ تھے۔ مدرسہ والد ماجدؒ کے موروثی مکان کے باہر افتادہ زمین پر بنے ہوئے چند کمروں میں چل رہا تھا۔ دارالاقامہ بھی قائم تھا۔ جس میں ۱۵-۲۰ بیرونی طلبہ کا قیام تھا۔ مدرسہ کے آس پاس کی تمام گذرگاہیں کچی تھیں اور مدرسہ میں بجلی کا کنکشن نہ ہونے کی وجہ سے لال ٹینوں، اور پھر کچھ عرصہ بعد پیٹرومیکس سے کام چلایا جاتا تھا —— ان سب کے باوجود طلبہ و اساتذہ کے اندر جو اخلاص اور اپنے مدرسہ کی محبت تھی، اس کا آج سہولتوں کے دور میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ "اس حسین ماضی" کی یاد آنے پر سرد آہیں بھرتے ہوئے یہ گنگنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ؎

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اب یہ چھوٹا سا نومولود مدرسہ میری کارگاہ عمل بھی تھا اور میرے تصور کا دارالعلوم دیوبند بھی۔ اپنی مذکورہ بالا دو آئیڈیل شخصیتوں میں سے اول الذکر استاذ محترم حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحبؒ کی نقلیں کرنا تو ممکن نہ تھا کیوں کہ اس کی اولین اور بنیادی شرط "شیخ بخاری" ہونا تھی، اور یہاں تدریس کے

لئے سب سے اونچی کتابیں میزان الصرف اور منہاج العربیہ میسر تھیں۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم چوں کہ مدرس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھے، اس لئے ان کی الٹی سیدھی نقلیں کرنے کے لئے میدان کافی وسیع تھا۔ پھر یوں بھی حماسہ نہ سہی، ادب عربی سے تعلق رکھنے والی کتاب "منہاج العربیہ" تو نقالی کے لئے تھی ہی۔ چنانچہ پہلی نقل تو یوں شروع ہوئی کہ جس طرح مولانا کیرانوی مرحوم نے "صف نہائی" کے طلبہ کے لئے "حماسہ" کی گھنٹی میں یہ پابندی لگا رکھی تھی کہ اس گھنٹی میں کوئی طالب علم کسی قسم کی بات چیت، سوال جواب، اردو میں نہیں کرے گا۔ بلکہ جیسے بھی بن پڑے عربی ہی میں بولنا بات کرنا ہے۔ اگر کسی اردو لفظ کی عربی نہیں معلوم ہے تو عربی جملہ میں وہ اردو لفظ ہی شامل کر دیا جائے، مگر جملہ عربی ہی ہونا چاہئے۔ مثلاً اگر کسی کو گلاس کی عربی نہیں معلوم ہے اور یہ کہنا ہے کہ یہ میرا گلاس ہے تو ھذا گلاسی بولا جائے۔ اسی طرح طالب علم کو کوئی درخواست دینا ہے تو اسے بھی عربی ہی میں لکھا جائے، چاہے اس میں زبان و قواعد کی کتنی ہی غلطیاں ہو جائیں —— میں نے اسی کی کچی پکی نقل "منہاج العربیہ" میں اس طرح شروع کی سہ ماہی امتحان کے بعد (واضح رہے کہ اس وقت ہمارے تمام مدارس میں تین امتحانات، صفر کے پہلے عشرہ میں سہ ماہی، جمادی الاولیٰ کے پہلے عشرہ میں ششماہی، اور پھر شعبان میں سالانہ ہوا کرتے تھے) اپنے طلبہ پر قید لگادی کہ کسی کو کسی قسم کی درخواست دینا ہے تو وہ عربی ہی میں لکھے، اور ہر مہینے میں کم از کم ہر طالب علم کو دو درخواستیں لکھنا ضروری بھی ہے۔ چاہے واقعی اس کی

ضرورت ہو یا نہ ہو؟۔ اندازہ کیجئے کہ منہاج العربیہ حصہ اول جیسی بالکل ابتدائی کتاب پڑھنے والے طلبہ کو حماسہ جیسی ادب عربی کی بڑی اور اہم کتاب پڑھنے والے طلبہ کی جزوی نقل کا پابند بنانا بھی کیسی ''مسخرہ خیز'' حرکت تھی —— مگر وہ جو دارالعلوم فاروقیہ کا مولانا وحید الزماں بننے کا ایک جنون تھا، وہ کہاں سوچ بچار اور عقل وخرد سے میل کھانے کی اجازت دیتا تھا؟—— کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ چنانچہ میری اس بے جا جسارت، یا عقل وتدبر سے عاری حرکت کا یہ خوش گوار نتیجہ تو ظاہر ہو کر رہا کہ منہاج العربیہ کے کم عمر طلبہ بھی چند سطروں کی درخواستیں عربی میں لکھنے لگے۔ اگرچہ ان چند سطروں میں بھی کئی کئی غلطیاں ہوتیں، مگر یہی کیا کم تھا کہ اپنی بساط سے بڑھ کر ہمارے یہ کم سن طلبہ حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں اپنی اور اپنے طلبہ کی کامیابی کی رفتار سے خوش ہو کر اپنی پیٹھ بھی خود تھپتھپا لیتا اور اپنے طلبہ کی بھی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتا۔

بہت دنوں تک میرا یہ معمول رہا کہ ان درخواستوں میں سے اچھی اچھی چھانٹ کر ایک فائل میں رکھتا جاتا۔ اور مدرسہ میں آنے والے بیرونی علماء واساتذہ کو یہ درخواستیں دکھا دکھا کر داد وتحسین حاصل کرتا رہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ درخواست لکھنے والے کم سن طالب علم کو روبرو کر کے اسے بھی علماء واساتذہ سے شاباشی دلواتا۔

میری یہ اور اس جیسی دوسری حرکتوں کی دھمک آس پاس کے مدارس تک ہی نہیں، عربی زبان وادب کی ممتاز دینی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

تک پہنچی۔ اور مجھے بتانے والوں نے بتایا کہ وہاں کے بعض اساتذہ آپس میں چرچا کرتے ہیں کہ یہ آخر دارالعلوم فاروقیہ ہے کیا؟۔

یوں تو غیر محسوس طور پر اور بلا ارادہ وقصد نہ جانے کہاں کہاں اور کتنی مرتبہ میں نے ''اپنے آئیڈیل'' کی نقالی کی کامیاب یا ناکام کوششیں کی ہوں گی؟۔ لیکن مدرسہ کے تعلق سے ایک ''اختراعی کوشش'' قابل ذکر ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں میرے ''ہدایہ اخیرین'' کے استاذ حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحبؒ کا انداز تدریس بڑا نرالا تھا۔ اس زمانے میں دارالعلوم کے دو ممتاز اور اہم ترین عہدوں پر فائز استاذوں میں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحبؒ ناظم تعلیمات اور حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ نائب مہتمم کے ذمہ الگ الگ ترتیب کے طلبہ کی ''ہدایہ اخیرین'' کی تدریس تھی، اور دونوں کا اپنا الگ الگ رنگ تھا۔ ہمارے میاں صاحبؒ بہت مختصر اور سہل انداز میں کتاب کو حل کراتے اور ضروری متعلقہ مسائل کی تشریح اس طرح کرتے کہ سننے اور دلچسپی لینے والے طلبہ کو کتاب اور اس کے فن سے بہت اچھی مناسبت ہو جاتی۔ پورے تعلیمی سال میں ان کے سبق کا شاید ہی کبھی ناغہ ہوا ہو، کتاب کے اسباق کی رفتار ایسی ہوتی کہ بھاگ دوڑ والی نوبت کبھی نہیں آتی اور آسانی کے ساتھ کتاب کا نصاب پورا ہو جاتا۔ جب کہ بیشتر اساتذہ سال کے ابتدائی حصہ میں ایسی مفصل بحثیں کرتے ہیں کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ آخر تک نصاب پورا ہو بھی سکے گا کہ نہیں؟۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب انہیں نصاب پورا کرنے کا خیال آتا ہے تو

بھاگم بھاگ ہونے لگتی ہے؟۔

ہمارے میاں صاحبؒ اپنے انداز میں اس کو یوں بیان فرماتے کہ شوال سے سہ ماہی تک کتاب اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ استاذ سمجھ کر پڑھاتا ہے اور طالب علم سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ پھر سہ ماہی سے ششماہی تک استاذ تو سمجھ کر پڑھاتا ہے لیکن طالب علم بے سمجھے بس سبق پڑھتے ہیں۔ اور ششماہی سے سالانہ تک نہ استاذ سمجھ کر پڑھاتا ہے اور نہ طالب علم سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ بس نصاب پورا کرنے کی دھن میں کتاب پڑھی پڑھائی جاتی ہے ——اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں طلبہ میں کتاب اور اس کے فن سے مناسبت پیدا نہیں ہو پاتی اور ان کی ساری جدو جہد امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔

استاذ محترم کے اس اہم اور لائق توجہ تبصرہ کو ملحوظ رکھ کر اس سلسلہ میں میں نے ایک کامیاب ''اختراعی کوشش'' یہ کی کہ اس وقت کے نصاب میں داخل از ابتدا تا انتہا، تمام کتابوں کے داخل نصاب حصہ کو تین مرحلوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ اس کا بیس فیصد پہلے مرحلہ میں یعنی از ابتدا تا امتحان سہ ماہی پڑھایا جائے۔ پھر اس کے بعد چالیس، چالیس فیصد دونوں مرحلوں، یعنی سہ ماہی تا ششماہی اور ششماہی تا سالانہ میں پڑھایا جائے ——اس کے لئے میں نے سخت جدو جہد کر کے تنہا اپنے دم پر ہر ہر کتاب کے نصابی حصہ کے اوراق وابواب کی مناسب طریقہ پر تقسیم کرتے ہوئے نشان زد کر کے اس کا نقشہ بنایا اور اس کی کتابت کرا کے خوبصورت فریم کے ساتھ اسے اپنے دفتر

میں آویزاں کرا دیا۔ سال کے آغاز میں تقسیم کتب کے بعد اساتذہ کو اس بات کی ہدایت کی جاتی کہ وہ اپنی متعلقہ کتابوں کے اسباق کی تدریس اسی ''نقشہ رفتار تعلیم'' کے مطابق کریں۔ اور وقتاً فوقتاً خود ہی اس نقشہ کے مطابق اپنی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہیں۔ پھر اسی کے ساتھ خود مطلع رہنے اور اساتذہ کے اپنی ذمہ داری کی طرف متوجہ رہنے کے لئے تقسیم اسباق کے بعد ہر ہر استاذ کے نام اور اس کے زیر تدریس کتابوں کے ناموں کے ساتھ ماہ بہ ماہ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہنے کے لئے ایک دوسرا نقشہ بھی تیار کیا جو ذی قعدہ سے لے کر شعبان تک ہر عربی مہینے کی ۵/تاریخ کو ہر استاذ کے پاس بھیجا جاتا کہ وہ اپنے پچھلے ایک ماہ میں پڑھائے گئے اسباق کا صفحہ نمبر اور متعلقہ بحث کی تفصیل کے ساتھ اندراج کر کے اپنے دستخط ثبت کریں۔ اور پھر اس کا جائزہ لے کر صدر مدرس اپنے تصدیقی دستخط ثبت کرے۔ چوں کہ یہ ایک نقشہ پورے تعلیمی سال کے لئے تھا، اس لئے ہر مدرس کے سامنے خود اس کی کارکردگی ماہ بہ ماہ آتی رہتی اور وہ خود ہی اپنا جائزہ لیتا رہتا کہ پچھلے ایک ماہ کے دوران کتنا پڑھایا تھا اور رواں ماہ کے دوران کتنا پڑھایا۔ نیز یہ کہ مقررہ نصاب تک پہنچنے کی کیا صورت حال ہے؟۔

اس ''خاموش پیغام'' کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ اساتذہ کا اپنا وقار بھی برقرار رہتا، اور کسی ٹوکا ٹاکی کے بغیر وہ اپنی متعلقہ ذمہ داری کی طرف خود ہی متوجہ رہتے۔ اسی کے ساتھ صدر مدرس کو بھی اپنے اساتذہ کے فرائض منصبی کی ادائیگی کا جائزہ لینے میں تعاون ملتا۔ اس طرح آسانی کے ساتھ کسی

اضافی مشقت کے بغیر ہر کتاب کی نصاب تعلیم کے مطابق تکمیل ہوجاتی ۔

واضح رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب آج کل کی طرح کمپیوٹر کا چلن نہیں تھا، اس لئے ہر نئے تعلیمی سال کے آغاز پر مجھے اساتذہ کی تعداد کے مطابق نقشے اپنے ہاتھ سے بنانا پڑتے تھے۔ جس میں کافی وقت اور جسمانی و دماغی محنت کرنا پڑتی — مگر اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے مقابلہ میں یہ محنت اور ایکسر سائز ہیچ نظر آتی ۔

یہ نقشہ نصاب تعلیم، مروجہ نصاب کے مطابق کتابوں کی تبدیلی کے ساتھ آج بھی دار العلوم فاروقیہ میں رائج ہے۔ البتہ اب صرف ''نقشہ رفتار تعلیم'' ہی ہے جو کہ دار المطالعہ (لائبریری) میں کمپیوٹر کی خوبصورت کتابت کے ساتھ نمایاں طور پر آویزاں ہے —— مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کے پہلے کی طرح مؤثر ہونے کی طرف سے مجھے اطمینان نہیں ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ ماہ بہ ماہ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے ''اساتذہ والے نقشہ'' کا چلن نہیں ہے۔ اور نہ اب میرے پاس وہ ''منصبی ذمہ داری'' ہے نہ ہی اپنی عمر وضعف کی وجہ سے اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لائق ہی رہا ہوں؟ ۔ ؎۱

؎۱ بفضلہٖ تعالیٰ اس احساس تشنگی اور میری بار بار کی ترغیب کے نتیجہ میں ماہانہ مقدار تعلیم سے واقفیت کا یہ سلسلہ بھی اب جاری ہوگیا ہے۔ جس کے لئے بجائے الگ الگ نقشہ کے ایک ہی رجسٹر میں تمام اساتذہ کے لئے الگ الگ اندراجات ہوتے ہیں، اور ناظم تعلیمات کی طرف سے ہر عربی ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں یہ رجسٹر اساتذہ کے پاس بھیج کر حسب سابق ماہ بہ ماہ کی مقدار خواندگی کا اندراج کرالیا جاتا ہے۔

ہمارے یہ ''اختراعی نقشے'' اتنے پسند کئے گئے کہ مختلف مناسبتوں سے مدرسہ میں آنے والے متعدد سینئر و لائق اعتماد و اعتبار علماء و اساتذہ نے انہیں اس طرح سراہا کہ مجھے اپنی اس کارکردگی پر شرح صدر ہوگیا۔ یہاں تک کہ مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد انصار الحق صاحبؒ (جو کہ میرے والد ماجدؒ کے بہت بے تکلف دوستوں میں سے تھے) ہمارے مدرسہ کے طلبہ کے سالانہ امتحان کے لئے تشریف لائے، اور کئی دنوں تک مدرسہ میں قیام کر کے طلبہ کا امتحان لینے کے ساتھ ہی گھوم پھر کر ہر طرح مدرسہ کا جائزہ بھی لیا، اور مجھے و دیگر موجود اساتذہ کو متعدد قیمتی و مفید مشورے بھی دیئے —انہوں نے اس دوران ایک مرتبہ مجھے بہ طور خاص طلب کر کے مجھ سے سوال کیا کہ یہ ''نقشہ رفتار تعلیم'' تم نے ہی بنایا ہے؟ میرے اثبات میں جواب دینے پر بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ ہاں مجھے یہی توقع تھی کہ تم نے ہی بنایا ہوگا۔ پھر مجھے حکم دیا کہ اس نقشہ کی ایک نقل مجھے بھی دے دو، میں اس کو مدرسہ شاہی کے اساتذہ کو دکھاؤں گا، اور اسے وہاں بھی رائج کرنے کی کوشش کروں گا—— بہت عمدہ اور مفید کام تم نے کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے روشن مستقبل اور سعادت دارین کی خوب خوب دعائیں دے کر اس طرح شاد کام کیا کہ مجھے یہ لگا کہ اب صحیح معنوں میں میری محنت کی قیمت وصول ہوئی ہے؟۔ اسی کے ساتھ حضرت مولاناؒ نے تو اپنی تعریف و توصیف اور حوصلہ افزائی کی قیمت مجھے یہ حکم دے کر وصول کر لی کہ ''اس نقشہ کی ایک نقل مجھے بھی دے دو'' مگر مجھے بہر حال اس

آزمائش سے ایک مرتبہ پھر کامیابی کے ساتھ گذرنا پڑا کہ $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ سائز کے پورے کاغذ پر اسی طرح لکیریں کھینچ کر اور خانوں میں کتابوں کے ناموں اور ان کی تینوں مراحل کی مقدار تعلیم کا اندراج کرنا پڑا جیسا میرے آویزاں نقشہ میں تھا —— اس ''محنت شاقہ'' سے گذرنا اس لئے ضروری تھا کہ اس وقت ہمارے لکھنؤ میں اتنی بڑی فوٹو کاپی کرنے والی مشین نہیں آئی تھی جو اتنے بڑے کاغذ کی یک جا فوٹو کاپی کر سکے۔

بہ ہر حال مجھے خوشی ہوئی کہ اپنی اس مشقت کے ذریعہ اپنے ایک بزرگ اور مستند عالم دین ہونے کے ساتھ ہی اپنے والد کے ایک دوست کو خوش کر کے ایک مرتبہ پھر ان کی دعائیں بٹوریں —— یہ ''اضافی مسرت'' تو ناقابل بیان تھی کہ میرا ''اختراعی نقشہ رفتار تعلیم'' مدرسہ شاہی جیسے ملک کے ایک بڑے اور قدیم مدرسہ میں بھی پذیرائی حاصل کرے گا۔

ہاں اس موقع پر حضرت مولانا سے وابستہ ایک اہم بات اور بھی قابل ذکر ہے کہ اپنے قیام کے دوران میری موجودگی میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ والد ماجد سے پوچھا کہ ''تم میرے اس بیٹے کو کیا تنخواہ دیتے ہو''؟ والد صاحب نے جب جواب میں کہا کہ ڈیڑھ سو روپئے، تو حضرت مولانا کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ اور انھوں نے والد صاحب سے بڑی بے تکلفی اور ناگواری کے ساتھ فرمایا کہ ''تم اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے اس نوخیز و ہونہار بچہ کو قربان کر کے بڑی خودغرضی کا ثبوت دے رہے ہو؟۔ اس بچہ کی اچھل کود بتا رہی ہے کہ اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔

تمہارے اس چھوٹے سے مدرسہ میں یہ کیا کرے گا؟ اسے سنوارنے اور اٹھانے ہی میں اس کی عمر گذر جائے گی؟۔ اس کو تم مدرسہ شاہی کے لئے مجھے دے دو، میں اسے فی الحال پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ دوں گا۔ اور پھر ایک بڑے مدرسہ کی کھلی فضا اور تجربہ کار اساتذہ کی سرپرستی میں اسے کام کرنے کے مواقع ملیں گے تو ان شاء اللہ ایسا کر کے دکھائے گا کہ تم بھی اس پر فخر کروگے''۔

جواب میں والد ماجدؒ تو بس مسکرا کر رہ گئے تھے، لیکن میں اتنے بڑے عالم کی زبان سے اپنی تعریفیں سن کر مسرت سے جھوم اٹھا تھا۔ جہاں تک حضرت مولانا کی طرف سے مدرسہ شاہی کی ملازمت کی پیش کش کا معاملہ تھا تو اسے قبول کر کے ''ایک بڑے مدرسہ کے مقبول استاذ'' بننے کی طرف تو مجھے ذرا بھی التفات نہیں ہوا تھا، لیکن اس شاندار حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں میرے اندر کچھ اور اچھا کرنے کی امنگ ضرور پیدا ہو گئی تھی —— ایسے ہی تھے ہمارے اکابر کہ اپنی حکمت عملی اور حوصلہ افزائیوں کے ذریعہ مٹی کو سونا بنانے کا کیمیا جانتے تھے۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء۔**

میرے دار العلوم فاروقیہ سے وابستہ ہونے کے بعد کئی برسوں تک ایسا ہوتا رہا کہ ہر سال ایک نئی اوپر کی عربی جماعت قائم ہوتی رہی۔ اور ایک نئے استاذ کا اضافہ ہوتا رہا۔ چونکہ والد ماجدؒ کے ضلع اعظم گڑھ و مئو سے دیرینہ رشتے تھے۔ سب سے بڑھ کر تو مئو میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ کی ذات گرامی تھی، جن کا میرے دادا صاحبؒ (حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے نہایت ہی یارانہ و بے تکلفانہ رشتہ

تھا۔جس کی بنیاد پر وہ والد ماجدؒ کو مثل اولاد سمجھتے اور برتتے تھے۔ پھر مبارک پور کے جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ان کے ہم سبق درسی ساتھی، نیز پورے ضلع کے مسلمانوں کے محبوب قائد و رہنما حضرت مولانا عبدالباری قاسمیؒ ناظم تھے۔حضرت مولانا بشیر احمد صاحبؒ اسی جامعہ کے سینئر استاذ اور غالباً صدرالمدرسین تھے۔اور حضرت مولانا عبدالستار صاحبؒ وہاں کی مجلس شوریٰ کے نہایت ہی فعال و مؤثر ممبر اور مولانا عبدالباری صاحبؒ کے مشیر خاص اور ہر طرح کے معاون تھے۔اسی طرح خیرآباد اور پورہ معروف کے عوام وخواص میں والد صاحبؒ کی بہت مقبولیت تھی۔وہ ان تمام مقامات کے دینی جلسوں میں بہ حیثیت ایک پرجوش اور کامیاب خطیب سال میں کئی کئی مرتبہ جاتے تھے۔اس طرح مجموعی طور پر پورے ضلع اعظم گڑھ کے علماء، مدارس، اور عوام وخواص سے ان کے بہت مضبوط و مستحکم رشتے تھے۔ پورے ضلع میں مدارس دینیہ کا جال ہونے کی وجہ سے اس ضلع کو علماء کی ''ایسی کان'' سمجھا جاتا تھا جس میں ہر برس درجنوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ والد صاحبؒ ہر سال ایک نئے استاذ کے اضافہ کے لئے مئو میں حضرت الاعظمیؒ یا پھر مبارک پور میں مدرسہ احیاء العلوم کے اپنے دوستوں سے مطالبہ کرتے اور ان کی طلب پوری ہو جاتی۔ دارالعلوم فاروقیہ سے بہ حیثیت استاذ وابستہ ہونے والے یہ علماء نوجوان اور نو فارغ و ناتجربہ کار ہی ہوا کرتے تھے۔ بلکہ کئی استاذ تو ایسے بھی آئے جنہوں نے شعبان میں دارالعلوم دیوبند یا کسی دوسرے مدرسہ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور شوال میں تعلیمی سال کے آغاز پر ہمارے مدرسہ

میں بہ حیثیت استاذ آ گئے۔ان آنے والوں میں سب سے پہلا تقرر مولانا عبدالمعید قاسمی صاحب کا ہوا۔جن کی دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث سے فراغت میرے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ اور وہ بعد میں اپنی مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم اعلیٰ بھی بنے۔ان کے بعد آنے والوں میں مولانا محمد عامر صاحب (جو بعد میں احیاء العلوم کے نائب ناظم بھی بنے) مولانا محفوظ الرحمن کریمی صاحب، مولانا ظہیر احمد صاحب، مولانا بدرالدین صاحب، مولانا جمیل احمد نذیری صاحب، مولانا غلام محمد صاحب، مولانا عزیز الرحمن صاحب کے نام یاد آ رہے ہیں۔ یہ تمام حضرات آتے جاتے رہے۔ان میں سب سے طویل رشتہ مولانا جمیل احمد نذیری صاحب کا رہا جو چھ برس سے زائد کی مدت پر مشتمل رہا۔ مولانا نذیری دارالعلوم دیوبند سے شعبان میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے فوراً بعد ہی شوال میں دارالعلوم فاروقیہ سے وابستہ ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ یوں بھی اس وقت بہت کم عمر تھے اور جسم و جثہ ایسا تھا کہ دیکھنے میں کوئی طالب علم لگتے تھے (اس غلط فہمی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا تھا جس کا ہم لوگ برسوں ذکر کرتے رہے تھے) مولانا ہمارے مدرسہ میں ''ایک سادہ ورق'' کی صورت میں نوجوان و باصلاحیت استاذ کے طور پر آئے۔ اور جب چھ برس سے زیادہ کا وقت یہاں گذار کر اپنی مادر علمی احیاء العلوم مبارک پور سے وابستہ ہوئے تو وہ کئی کتابوں کے مصنف، اچھے خاصے مقرر و شاعر، اور ایک کامیاب مدرس کی حیثیت لے کر گئے۔ اور آج تو ماشاء اللہ ان کا شمار ملک کے مؤقر علماء و مفتیوں میں ہوتا

ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج بھی مولانا نذیری سے ہمارے خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ ہم ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔

یہی حال دیگر آنے والے اساتذہ کا بھی رہا کہ جو بھی یہاں سے گیا وہ منجھ کر اور یہاں سے بڑھ کر اعزاز و منصب سے وابستہ ہو کر گیا۔ فالحمد للہ!

اس کی بنیادی وجہ یہ رہی کہ ہمارے یہاں نوجوان علماء کی ایک ایسی ٹیم بن گئی تھی جس کو اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے کے بھرپور اور آزادانہ مواقع حاصل تھے۔ ایک ایسی دوستانہ و بے تکلفانہ فضا جس میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں تھا، نہ ہی کسی پر عہدہ و منصب کا کوئی نشہ چڑھا تھا —— ساتھ ہی ہر ایک کا یہ عزم کہ ؎

نوجواں جذبات سینے میں ہیں، دل نوجواں خود نوجواں
حق کو اونچا کرنے آیا ہوں میں زیر آسماں

ہماری حصول یابیاں: اس بے تکلف اور پر عزم دوستانہ فضا نے ہم میں سے ہر ایک کو مضمون نگار بھی بنا دیا، شاعر بھی، مقرر بھی، اور مفتی بھی — یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اپنے اپنے طبعی ذوق و صلاحیت کے مطابق سب کا جامع کوئی نہیں رہا۔ اور سب کی الگ الگ شناخت بنتی گئی؟۔ آج ''تحدیث نعمت'' کے طور پر اس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے دارالعلوم فاروقیہ سے وابستہ رہنے اور یہاں کی بے تکلف علمی فضا سے سیکھنے والوں میں مولانا محمد کاظم ندوی جیسے کثیر التصانیف منصف و شاعر، مولانا جمیل احمد نذیری جیسے مؤقر مفتی، منتظم و شاعر، اور قاری محمد حبیب الرحمن

کیفؔ بلاسپوری جیسے قرآن کے مجود و مربی اور شاعر ابھی ماشاءاللہ زندہ و سلامت اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں مصروف عمل ہیں[۱]۔ جب کہ میرے دیرینہ ساتھی اور رفیق درس مولانا فضل الرحمن گونڈوی جیسے کامل الاستعداد مدرس اور کم گو لیکن خوش گو شاعر حالیہ ''کرونا دور میں'' کم و بیش ایک برس پہلے ممبئی میں، اور ہمارے بڑے اور ہم سے پہلے دارالعلوم فاروقیہ سے وابستہ ہو کر برسوں اپنی تدریسی خدمات سے فیض پہنچانے والے استاذ حضرت مولانا رفیق احمد صاحب اعظمیؒ ہماری اس فارنی دنیا کو چھوڑ کر اپنے ''رفیق اعلیٰ'' سے مل چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر اپنے انوار کی بارش کرے۔ (آمین)

دارالعلوم فاروقیہ کے ابتدائی ''دور زریں'' کے بے تکلف رفقاء تدریس میں مولانا محفوظ الرحمن کریمی، مولانا محمد فضل الرحمن نعمانی، اور مولانا غلام محمد صاحب ولید پوری کے بھی نام یاد آ رہے ہیں۔ جن کے حال احوال، حتیٰ کہ ان کی موت و زیست سے بھی برسوں سے بے خبر ہوں۔ دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں، رب کریم ان کے ساتھ اپنے شایان کرم خیر کا معاملہ فرمائے۔ (آمین)

اس سلسلہ میں دو ایسے خردوں کا ذکر بھی مناسب ہے، جنہوں نے دارالعلوم فاروقیہ میں رہ کر تعلیم بھی حاصل کی، اور پھر یہاں بہ حیثیت استاذ وابستہ رہ کر اپنے مدرسہ اور اپنے اساتذہ کے اوپر اپنی وفاداری اور بے لوث محنت کے ان مٹ نقوش ثبت کئے۔ ان میں کا پہلا نام مولانا حبیب الرحمن

[۱] بھی گذشتہ رمضان ۱۴۴۵ھ میں اچانک قاری حبیب الرحمن صاحب کے فرزند ظل الرحمن نے اطلاع دی کہ قاری صاحب بھی اس فانی دنیا سے کوچ کر کے عالم باقی کی طرف چلے گئے۔ فَرَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ رَحْمَةً وَاسِعَةً

پورنوی کا ہے جو اس وقت اپنے وطن کے قریب کی ایک بستی اسلام پور ضلع پورنیہ کے مدرسہ انوار العلوم کے سینئر استاذ اور اس مدرسہ کی روح رواں ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھ سے اور اپنے مدرسہ کے موجودہ اساتذہ سے باقاعدہ ومضبوط رابطہ بھی قائم کئے ہوئے ہیں۔ دوسرے کا کوری سے چند کلومیٹر پر واقع ''ہمراپور'' نامی بستی کے باشندے حافظ محمد ہاشم مرحوم کا نام ہے، جو اپنے دو اور ساتھیوں حسین احمد اور محمد منور کے ساتھ بہت کم سنی میں مدرسہ کے درجہ حفظ میں داخل ہوئے، اور پھر حفظ کی تکمیل کے کچھ عرصہ بعد بہ حیثیت استاذ درجہ حفظ مدرسہ سے وابستہ رہ کر تادم حیات اپنی وفاداریوں، اطاعت گذاریوں، اور پرعزم کارگذاریوں کے ساتھ اس طرح جڑے رہے کہ چند برس قبل جب وہ اچانک ''برین ہیمبرج'' کے شدید حملہ کے شکار ہو کر ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے تو مجھے اور مجھ جیسے بہت سے اپنے بڑوں اور چھوٹوں کو اشک فشانی پر مجبور کر گئے۔

حافظ ہاشم مرحوم ''اپنی مخصوص وفادارانہ وخردانہ اداؤں'' کے ساتھ اس کثرت سے یاد آتے رہتے ہیں کہ میں نے اپنی ایک کتاب ''رہنمائے تقریر وخطابت'' کا انتساب بھی ان ہی کے نام کیا ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کے محرک اول وہی تھے —— مگر اس کی ترتیب واشاعت ان کی وفات کے بعد ہی ہوسکی۔ فرحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

دارالعلوم فاروقیہ کے ابتدائی دور سے وابستہ یادوں میں ان شعری نشستوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں، جن کے ذریعہ چند بے تکلف

احباب میں سے ہر ایک کو ''شعر گوئی'' پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ چاہے طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو، اور شعر کے نام سے پیش کئے جانے والے کلام میں ''شعریت'' کے تقاضوں کی رعایت ہو یا نہ ہو؟۔

مہینے میں دو مرتبہ جمعرات کے دن بعد نماز ظہر تا نماز عصر سجنے والی ان شعری نشستوں کی ترتیب یہ رہتی کہ ایک مرتبہ نعت کا کوئی مصرع اور دوسری مرتبہ غزل کا کوئی مصرع طبع آزمائی کے لئے باہمی مشورہ سے دیا جاتا اور پھر پندرہ دن کے بعد ہر شاعر یا ''متشاعر'' کی شاعری امتحان کے مرحلہ سے گذرتی۔ اپنی سمجھ میں آنے والے اچھے شعروں پر کھل کر داد دی جاتی، اور کمزور یا ناموزوں قرار دیئے جانے والے شعروں پر باقاعدہ ''ہوٹنگ'' بھی ہوتی۔

شرکائے بزم میں سے ہر ایک پر نعت یا غزل کہہ کر لانے اور سنانے کی اس طرح پابندی تھی کہ ''پنچوں کی رائے سے'' یہ فیصلہ سب کو سنادیا گیا تھا کہ جو صاحب اپنے کہے ہوئے اشعار کے بغیر شریک ہوں گے، ان پر جرمانہ یہ لگے گا کہ تمام شعراء اور چند ''خالص سامعین'' کو چائے ناشتہ کرانے کی ان ہی کی ذمہ داری ہوگی۔

چوں کہ ان شعری نشستوں کے انعقاد سے لے کر ان کی تمام سرگرمیاں رضاکارانہ وتفریحی انداز کی تھیں، اس لئے یہ ''جرمانہ'' کسی پر بار نہ ہوتا۔ مگر ہوتا یہ کہ ایک مرتبہ ''جرمانہ'' بھرنے والا اگلی نشست میں ''شاعر'' بن کر ہی شریک ہوتا تھا۔ اور اگر کسی نشست میں کوئی جرمانہ بھرنے والا نہ ہوتا تو ''باہمی چندہ'' سے شرکائے بزم کی ضیافت کا انتظام کرلیا جاتا۔

ان نشستوں میں کیسی کیسی کمال کی شاعری ہوتی تھی؟۔اس کا اندازہ جرمانہ بھرنے کے بعد پہلی مرتبہ ''اپنی نعت شریف'' کے ساتھ شرکت کرنے والے مولانا محمد فضل الرحمن نعمانی کے اس ''بے مثال مقطع'' سے کیا جا سکتا ہے کہ

اے نعمانی آؤ ''آب زمزم'' پیئیں
''حوض کوثر'' کا مجھ کو پتہ مل گیا

''آب زمزم'' سے ''حوض کوثر'' کا یہ بے مثال و نادر جوڑ ''جبری شاعری'' کی صرف ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا — ورنہ ایسی کئی دیگر مثالیں بھی ذہن میں کلبلا رہی ہیں؟۔ان نشستوں کا بہر حال یہ فائدہ تو ہوا ہی کہ مولانا محمد کاظم ندوی، اور مولانا جمیل احمد نذیری با قاعدہ اور ''با کتاب'' شاعر بن گئے۔بڑی حد تک قاری حبیب الرحمن بھی شاعر بن گئے تھے جو اپنی شاعری کو اب تک پروان چڑھانے میں مشغول ہیں۔مولانا فضل الرحمن گونڈوی مرحوم تو پہلے ہی سے با قاعدہ اور بہرائچ کے زمانۂ طالب علمی میں جمال بہرائچی کے تلمذ میں رہ کر شاعر بن چکے تھے۔

بعد میں مولانا محمد کاظم ندوی نے اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کر کے اس نشست کے لئے کہی گئی نعتوں کا ایک مختصر مجموعہ ''گلدستۂ نعت'' کے نام سے اپنے ''مکتبہ ایوب'' سے شائع کیا تھا۔جس میں تین یا چار نعتیں راقم الحروف کی بھی شامل ہیں۔(یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میرا ''ذوق شاعری'' ان نشستوں سے شروع ہو کر ان نشستوں ہی کے ساتھ ختم

ہو گیا۔جب کہ دوسرے کئی احباب ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے با قاعدہ شاعر بھی بن گئے)۔

البدر کا اجراء: اسی سلسلہ خیر و برکت کی ایک کڑی جون ۱۹۷۷ء سے جاری ہونے والا رسالہ ماہنامہ ''البدر'' بھی ہے۔مدرسہ کے تدریسی نظام میں بڑے اہتمام کے ساتھ کم از کم ایک ''تعلیمی گھنٹی'' ایسی ضرور رکھی جاتی جس میں ہم چند احباب و رفقاء، خصوصاً راقم الحروف، قاری محمد حبیب الرحمن، مولانا محمد کاظم ندوی، مولانا شبیر احمد، اور مولانا جمیل احمد نذیری یک جا ہو کر ''کچھ نہ کچھ نیا کرنے'' کے منصوبے بناتے ——— ایسی ہی ایک نشست میں مدرسہ کے ترجمان کی حیثیت سے ایک رسالہ کے اجراء کا منصوبہ بھی بن گیا۔تصنیفی وصحافتی ذوق مجھے وراثت میں ملا تھا۔امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحبؒ کے شہرہ آفاق ماہنامہ ''النجم''۔پھر عم محترم مولانا عبد المؤمن الفاروقیؒ کے پر جوش صحافتی ذوق کے ماہنامہ، پھر ہفت روزہ ''النجم'' کے احیائے جدید سے لے کر روزنامہ ''آفتاب'' اور ہفت روزہ ''حرم'' تک۔اور والد ماجد حضرت مولانا عبد الحلیم صاحبؒ کی ادارت میں ادارہ ''دار المبلغین'' کے ترجمان ماہنامہ ''الداعی'' کے مستقل قارئین کی اچھی خاصی تعداد اس وقت بھی موجود تھی ——— جن کا پر زور تقاضا تھا کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں عم محترم مولانا عبد المومن الفاروقیؒ کے زیر ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ ''حرم'' کی اشاعت بند ہونے کے بعد سے اس ''خانوادۂ فاروقی'' کے مختلف با توفیق افراد کی طرف سے صحافت کے ذریعہ

اصلاح عقائد واصلاح فکر وعمل کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط مبارک ومسعود سعی کا سلسلہ موقوف ہوجانے کی وجہ سے ملک کے اطراف واکناف سے شائع ہونے والے سیکڑوں رسائل وجرائد کی اشاعت جاری رہنے کے باوجود ایک ''لے'' کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے جس کا آغاز امام اہل سنتؒ نے کیا تھا؟۔

میرے کچھ لکھنے پڑھنے کے ذوق، اور چند کتابوں، نیز ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہنے والے مضامین کو پڑھنے والے احباب وبزرگوں کی طرف سے بہ طور خاص مجھ سے اصرار ہوتا رہتا کہ تم اپنے بافیض خانوادہ کی صالح روایات کو باقی رکھنے اور انہیں جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس ''سلسلۂ فیض'' کو پھر جاری کرنے کی ''کچھ نہ کچھ'' توصلاحیت رکھتے ہی ہو، اس لئے تمہیں اللہ کا نام لے کر کوئی رسالہ جاری کرنا چاہئے۔

اِدھر میرا معاملہ یہ تھا کہ باوجود ''مہم جوئی'' کے ذوق کے اتنے اہم اور ذمہ دارانہ کام کی ہمت نہیں کر پارہا تھا —— اب جودار العلوم فاروقیہ کے اپنے جواں عمر وجواں حوصلہ احباب نے ایک رسالہ جاری کرنے کا منصوبہ بنایا تو مجھے ایسا لگا جیسے پرواز کے لئے پر، اور مہم سر کرنے کے لئے دست وبازو فراہم ہوگئے۔

ہم لوگ اپنی ''مجلس احباب'' میں پاس شدہ تجویز کو اپنے مشفق وکرم فرما مہتمم، دار العلوم فاروقیہ کے بانی، والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب

کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے تو انہوں نے ہماری توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نہ صرف اپنی سرپرستی کی اجازت دی، بلکہ اپنے بھرپور تعاون کا وعدہ کرتے ہوئے ہمارے حوصلوں وارادوں کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچادیا۔

ہم سب ہی صحافت کے آداب، اور کسی رسالہ کے اجراء کے قوانین وقواعد سے ناآشنا، اور بالکل ناتجربہ کار تھے۔ اس لئے طے پایا کہ کچھ آزمودہ کار صحافیوں سے رابطہ قائم کر کے ان کی رہنمائی میں کام کا آغاز کیا جائے —— اس سلسلہ میں ملاقاتیں تو کئی تجربہ رکھنے والے صحافیوں سے کی گئیں، مگر جو تعاون مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بھتیجے اور ان کے ''قلمی جانشین'' حکیم عبدالقوی صاحبؒ سے ملا، اور انہوں نے اپنی بزرگانہ شفقت کے ساتھ جس طرح ''میری انگلی پکڑ کر'' تمام قواعد وضوابط ہی نہیں، بلکہ اس سلسلہ کے ''اسرار ورموز'' بھی سکھائے۔ اور متعدد ملاقاتوں میں مرحلہ بہ مرحلہ انتہائی فراخ دلی کے ساتھ رہنمائی کی، اس کی سپاس گذاری کے لئے نہ میرے پاس مناسب الفاظ ہیں، نہ ہی زبان وقلم میں ان کو بیان کرنے کا یارا ہے۔ بس اپنے خالق ومالک اور ارحم الراحمین پروردگار سے دعا ہے کہ وہ ہمارے کرم فرما حکیم صاحب کو کروٹ کروٹ چین عطا کر کے ان کے ساتھ اپنے شایان رحمت معاملہ کرے۔ (آمین)

جوش وخروش کی کمی تو تھی نہیں، عمر بھی جوانی کی تھی، اس لئے بس یہی ایک دھن تھی کہ

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں کارواں کے سامنے
ہیچ ہیں لیکن مرے عزم جواں کے سامنے

چنانچہ پہلے مرحلہ میں اپنی طرف سے تجویز کئے گئے چند ناموں میں کسی ایک نام کی منظوری حاصل کرنے کے لئے ضابطہ کے مطابق درخواست دی گئی۔ ہماری ''مجلس مشاورت'' نے جو نام تجویز کئے تھے وہ ''الفاروق''، ''العدل''، ''البدر'' اور ''فاروقی آواز'' یاد آرہے ہیں۔ ان تجویز کردہ ناموں میں سے ''البدر'' کی منظوری ملی۔

اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں ضابطہ کے مطابق ''ڈکلریشن'' حاصل کیا گیا—اور پھر کتابت وطباعت کے مراحل سے گذر کر ''البدر'' کا جون کا پہلا شمارہ وسط مئی ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آ گیا۔ جس کے اندرونی پہلے ہی صفحہ میں والد ماجدؒ اور سرپرست رسالہ کا...... پرشکوہ اور حوصلہ افزا پیغام تھا۔

دو شماروں کی اشاعت کے بعد تیسرے مرحلہ میں ضابطہ کے مطابق ''رجسٹرڈ نیوز پیپر'' کے لئے محکمہ ڈاک سے ڈاک ٹکٹ میں رعایت کا سرٹیفیکٹ بھی حاصل کرلیا گیا۔ اور یہ تمام کارروائیاں حکیم صاحبؒ کی ہدایات کے مطابق انجام پائیں۔ ان تمام کارروائیوں کی تکمیل کے بعد اب مرحلہ خریداروں کی فراہمی کا تھا۔ اس وقت سالانہ زرخریداری بارہ روپے، اور ایک شمارہ کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی تھی (جو فی الوقت سالانہ دوسو روپئے، اور فی شمارہ بیس روپئے ہے)۔ خریداروں کی فراہمی میں والد صاحب کا سرپرستی میں نام، اور اس سے بڑھ کر ان کا اپنے حلقہ کے احباب کے نام

مطبوعہ خط بہت کام آیا۔ اور بالکل ابتدائی دور ہی میں رسالہ ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہونے لگا۔ رسالہ کے لئے مستقل لکھنے والوں میں راقم الحروف کے ساتھ ہی مولانا محمد کاظم ندوی صاحب، اور مولانا جمیل احمد نذیری صاحب کے نام شامل تھے۔ مولانا شبیر احمد قاسمی اور قاری محمد حبیب الرحمن کے مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے۔ قاری صاحب کی مضامین سے زیادہ نعتیں وغزلیں شائع ہوتیں۔ یوں اس کا چسکہ مولانا کاظم صاحب اور مولانا جمیل صاحب کو بھی لگا ہوا تھا—— مگر مضامین کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی منظوم کلام بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے ان ''نوآموز شعراء'' کا کلام ان کی دل جوئی کے لئے شائع کرنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت کے $\frac{20x30}{8}$ سائز میں ۳۲ صفحات کے عمومی شمارہ میں منظومات کے لئے عموماً دو صفحے ہی ہوتے تھے، جس کے لئے اس وقت کے مقتدر واستاذ شعراء کا کلام ہی اتنا ہوتا تھا کہ کئی کئی ماہ کے بعد کسی ایک دو کی باری آپاتی تھی۔ منظوم کلام کے حصول میں میرے مرحوم بھانجے (دارالعلوم فاروقیہ کے درجات عربی کے استاذ اور ''البدر'' کی مجلس ادارت کے رکن) مولانا عبدالمنان قاسمی کی دلچسپی کا خصوصی دخل تھا، جن کے شعراء سے گہرے دوستانہ انداز کے مراسم بھی تھے، اور وہ ان سے تعلقات قائم کرکے ان کا کلام ''البدر'' کے لئے حاصل کرلینے کا خصوصی ملکہ بھی رکھتے تھے۔ مرحوم کی اسی دلچسپی کی وجہ سے معروف نابینا شاعر کشفی لکھنوی، دل لکھنوی، شمیم جے پوری، کمال جائسی، وسیم بریلوی، بشیر فاروقی، اثر بہرائچی، کرشن بہاری

نور لکھنوی، حیات وارثی، تسنیم فاروقی، حامد بہرائچی اور ان جیسے دیگر ملک گیر حیثیت کے حامل شعراء کے کلام کی متعدد مرتبہ البدر میں اشاعت ہوئی۔ پھر میرا اپنا بھی ''شعری ذوق'' کبھی کبھی جوش مارتا تو میں بھی براہ راست یا بذریعہ خط کسی بڑے اور ''مدح صحابہؓ مشن'' سے جڑے شاعر سے رابطہ قائم کر کے اور ان کا کلام حاصل کر کے ''البدر'' میں شائع کرتا۔ ایسے مؤقر شعراء میں پاکستان کے علامہ اثر زبیریؒ اور ہندوستان کے علامہ رشید کوثر فاروقی کے نام تو فوری طور پر یاد آ گئے۔

''البدر'' کی اشاعت کا ایک سال مکمل ہونے پر مئی ۱۹۷۸ء کا شمارہ اضافی ضخامت کے ساتھ ''سالنامہ'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد بھی مختلف مناسبتوں سے مختلف مواقع پر ''سیرت نمبر''، ''شہادت نمبر''، ''اسلامی صدی ہجری نمبر''، ''امام اہل سنت نمبر'' اور سب سے آخر میں جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء کا مشترکہ شمارہ اپنے امیر کارواں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ''مولانا عبدالحلیم فاروقی نمبر'' کے عنوانوں سے شائع ہوتے رہے۔ ان خصوصی اور ضخیم نمبروں کے لئے ملک کے مقتدر علماء، شعراء اور صحافیوں سے رابطے قائم کر کے ان کے مقالات یا منظومات کو شامل اشاعت کیا گیا۔ ایسے مقتدر لوگوں میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ، حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ، حکیم عبدالقوی دریابادیؒ، مولانا ازہر شاہ قیصر، قمر جمالی (پاکستان) منصف مبارک پوری، حامد القادری

بارہ بنکوی، جیسے علماء، شعراء اور صحافیوں کے نام شامل ہیں۔

کبھی کبھی ''تبرکات اکابر'' کی صورت میں امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحلیم فاروقی صاحب، حضرت مولانا عبدالمومن الفاروقی صاحبؒ، وغیرہم کے مطبوعہ مضامین کی بھی قند مکرر کے طور پر اشاعت ہوتی رہی۔

''اپنی سنانے اور دوسروں کی سننے'' کے جذبہ سے ملک و بیرون ملک کے رسائل و جرائد اور اخبارات سے بڑی تعداد میں کوشش کر کے تبادلہ کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ اور اس ذیل میں دیگر مسالک و مذاہب کے متعدد رسائل و اخبارات سے تبادلہ کا سلسلہ بھی قائم کیا گیا۔ اس سلسلہ میں بریلوی مسلک کے ''اشرفیہ''، شیعوں کے ''الواعظ'' اور ''سرفراز'' اور قادیانیوں کے ''بدر'' کے نام بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ کچھ ''نہج سے ہٹے ہوئے'' رسائل میں ''الرسالہ''۔ اور ''تجلی'' کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ پاکستان کے ''نقیب ختم نبوت'' اور ''المنبر'' سے بھی کافی طویل عرصہ تک تبادلہ کا سلسلہ جاری رہا— حالاں کہ ان سب ہی سے دھیرے دھیرے کر کے کسی کی اشاعت بند ہو جانے کی وجہ سے، اور کسی کی ''اپنی پالیسیوں'' کی وجہ سے اپنے رسالہ یا اخبار کو باوجود بار بار کے تقاضے کے نہ بھیجنے کی وجہ سے تبادلہ کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اور اب نہ ان میں سے کسی کے یہاں ''البدر'' جاتا ہے نہ ہی ان میں سے کوئی ''البدر'' کے لئے آتا ہے۔ ان میں کئی ایسے ہیں جن سے طویل مدت تک ''یارانہ'' رہا۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے قلیل عرصہ میں ہی ''منھ

موڑ لینا'' مناسب سمجھا۔

اس دوران ''الواعظ''، ''سرفراز'' اور ''اشرفیہ'' سے تو کافی لمبی مدت تک ''آپادھاپی'' اور سوال و جواب اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ ''خیر خیریت'' وحیدالدین خاں صاحب مرحوم کے ''الرسالہ'' کی بھی وقتاً فوقتاً لی جاتی رہی ——یہ تمام رسائل اسی ''طوفان بلا'' کے نذر ہو گئے، اور ''البدر'' سے ان کے تبادلہ کا رشتہ منقطع کر لیا گیا؟۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے اور مولانا جمیل احمد نذیری صاحب نے اپنے اپنے موضوع متعین کر لئے۔ اور میں نے ''الواعظ'' اور ''سرفراز'' کے، جب کہ مولانا جمیل احمد نذیری صاحب نے ''اشرفیہ'' کے ''وار'' جھیلنے کے لئے خصوصی تیاریوں کے ساتھ رضا کارانہ پابندی قبول کر لی۔

اس ''سلسلۂ خیر'' سے اور جو کچھ ہوا وہ تو ہوا ہی ——میری اپنے موضوع پر، اور مولانا جمیل احمد نذیری کی اپنے موضوع پر متعدد کتابیں تیار ہو گئیں، جن کی اشاعت بعد میں ہوئی، اور بفضلہٖ تعالیٰ ان کتابوں کو اہل علم و ''اصحاب نظر'' کی طرف سے سراہا بھی گیا۔ اور ان کا نفع بھی عام ہوا۔ **فللّٰہ الحمد و لہ الشکر۔**

اللہ کے کرم سے ''البدر'' کی اشاعت کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے — مگر اب نہ وہ جوانی کی عمر ہے، نہ ان جوانوں کا ساتھ ہے۔ کچھ بڑھتی عمر اور ماحول کے بھی تقاضے ہیں۔ کچھ قارئین کا بدلا بدلا ''ذوق و ذائقہ'' ہے —اور ان سب پر مستزاد ''کچھ نئے پرانے کرم فرماؤں'' کے تقاضے، مطالبے، اور

بے طلب مشورے و ہدایات ہیں — پھر بھی اکیلے دم پر ہی سہی، اس طنطنے کے ساتھ کسی نہ کسی صورت ''البدر'' اب بھی جاری ہے کہ ؎

میں ایک قطرہ ہوں لیکن میرا الگ وجود تو ہے
ہوا کرے، جو سمندر مری تلاش میں ہے

دل یہی چاہتا ہے، اور کوشش بھی یہی ہے کہ تادم واپسیں ''البدر'' کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے — آگے ہونا وہی ہے جو مالک کائنات چاہے گا؟۔ ویسے اپنے دو فرزندوں مفتی حارث عبدالرحیم قاسمی اور مولانا معاویہ عبدالرحیم ندوی سے خصوصی طور پر توقع ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کی وراثت کا حق ادا کریں گے۔ یوں تو حق تعالیٰ کی خصوصی عنایت سے میرے ان کے علاوہ تین فرزندان قاری عبدالمعبود فاروقی، مولوی اسامہ عبدالاحد ندوی، اور مولوی سالم عبدالرحیم سلمہم بھی لائق و باصلاحیت ہیں۔ لیکن میرے قریب و مزاج آشنا اول الذکر دونوں فرزندان زیادہ ہیں۔ جب کہ باقی تینوں الگ الگ شعبہ ہائے حیات سے وابستہ ہیں —— لیکن خون بہر حال سب کا ایک ہی ہے اور تعلیم و تربیت بھی ایک ہی ماحول میں ہوئی ہے۔ اس لئے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مالک کس ذرہ کو کب آفتاب بنا کر چمکا دے؟ **وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز۔**

البدر اور رفقائے البدر کے سلسلہ کی یہ طویل گفتگو نا تمام رہے گی اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے کہ ہماری ان سرگرمیوں و دلچسپیوں کا اثر ہمارے طلبہ پر بھی ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ متعدد طلبہ وقتاً فوقتاً اپنی اپنی بساط کے مطابق

مضامین لکھ کر میرے پاس لاتے اور میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان میں حذف واضافے، اور ترتیب وتصحیح کر کے انہیں البدر کے صفحات میں جگہ دیتا۔ ایسے ہونہار طلبہ میں مولوی حبیب الرحمن پورنوی کا نام یاد آرہا ہے، جو خصوصیت کے ساتھ اس لئے قابل ذکر ہے کہ وہ اسی طرح لکھتے لکھاتے باقاعدہ مضمون نگار بن گئے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان کا دور طالب علمی سے فراغت کے بعد دارالعلوم فاروقیہ میں بہ حیثیت استاذ تقرر بھی ہو گیا۔ اور دور طالب علمی کے بعد اس دوسری حیثیت میں بھی ان کا کئی برس ساتھ رہا، اور اس دوران ان کا شوق تحریر وتقریر پروان چڑھتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں وہ اچھے خاصے ایسے مقرر بن گئے کہ بسا اوقات اطراف وجوانب کے تقاضے پر جلسوں کے مقرر کی حیثیت سے میں ان کو بھیجنے لگا۔ دوسری طرف البدر میں ان کے مضامین بھی چھپتے رہے۔ اور وہ ایک کتاب ''آداب السلام'' کے مصنف بھی بن گئے۔ پھر وہ اپنے وطن واپس جا کر وہاں کے ایک مدرسہ سے وابستہ ہو گئے، جہاں انہیں معاشی خوش حالی اور تاہلی زندگی کی نعمتیں تو ضرور مل گئیں لیکن لکھنے پڑھنے کا ذوق مناسب وموافق حالات میسر نہ ہونے کی وجہ سے ''زنگ آلود'' ہو کر رہ گیا۔

اللہ کے فضل کے بعد ان کی سعادت مندی کی وجہ سے ہمارے ان سے روابط قائم ہیں۔ ''کرونا دور'' سے پہلے تک ہر سال کم از کم ایک مرتبہ تو ان سے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ جب وہ اپنے مدرسہ کے مالی تعاون کے سلسلہ میں رمضان المبارک میں بنارس، اور کانپور کے ساتھ ساتھ لکھنؤ بھی آتے، اور پھر اپنا

مدرسے اور کاکوری کے اپنے شناساؤں سے ملنے ملاقات کرنے کیلئے کاکوری بھی جاتے۔ مگر اب دو سالوں سے تو بس ٹیلیفون ہی پر رابطہ ہوتا رہتا ہے۔ اور مولانا حبیب الرحمن ہی زیادہ تر ہفتہ دو ہفتہ بعد رابطہ کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے۔ اب تو وہ بھی نانا بن کر بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکے ہیں؟۔

دارالعلوم فاروقیہ کی بنا کا اصل جوہر اور اس کی برکتیں:

کہنے کو تو ابھی بہت کچھ ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ میری اس ٹوٹی پھوٹی بے رنگ وبے ربط داستان زندگی میں بھلا کتنے لوگوں کو دلچسپی ہوگی؟ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اکتا کر لوگ میری تحریریں پڑھنا چھوڑ دیں؟۔ اس لئے اس ناتمام داستان کو اسی جگہ روکنے سے پہلے دارالعلوم فاروقیہ جیسے ایک متوسط درجہ کے مدرسہ کی فیض رسانیوں، حصول یابیوں، اور دلچسپیوں کے پیچھے چھپی ہوئی ایک سادہ اور سہل الحصول حقیقت کی بھی نشان دہی کر دی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس مدرسہ کی بنیاد میں اخلاص وایثار کا جس قدر دخل رہا۔ اس کی مثالیں کم ہی مل سکیں گی ——— اس کی بنا کی داستان کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ لکھنؤ شہر سے کم وبیش ۱۲ رکلومیٹر دور پرانے ''صوبہ اودھ'' کا مشہور مردم خیز قصبہ کاکوری ہمارا اور ہمارے آباء واجداد کا وطن تھا۔ اگرچہ میرے والد ماجد اور دارالعلوم فاروقیہ کے بانی مولانا محمد عبد الحلیم صاحبؒ اور ان سے پہلے جد امجد حضرت مولانا عبد الرحیم صاحبؒ (برادر اصغر حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ) لکھنؤ کی سکونت اختیار کر چکے تھے، اور

ان کے خاندان کے بیشتر دادھیالی رشتہ دار بھی شہر لکھنؤ کے ساکن بن چکے تھے۔لیکن والد ماجدؒ کے بیشتر ننھیالی رشتہ داروں، اوران کی کئی بہنوں کی کاکوری ہی میں سکونت ہونے کی وجہ سے ان کا کاکوری برابر جانا ہوتا تھا۔ بلکہ والدصاحبؒ کے بیان کے مطابق ایک عرصۂ دراز تک تو انہوں نے کاکوری ہی کو اپنا ''وطن اصلی'' بنائے رکھا تھا، جب کہ لکھنؤ کو انہوں نے ''وطن اقامت'' کی حیثیت دے رکھی تھی۔

اپنے ماموؤں کی وفات کے بعد ننھیالی رشتہ داروں میں وہی سب سے بڑے مرد رشتہ دار تھے، جس کی لاج رکھتے ہوئے جب وہ کاکوری جاتے تو اپنے کم سن بھتیجوں، بھتیجیوں، اور بھانجوں بھانجیوں کے لئے ریزگاری کی صورت میں کچھ نقد رقم، اور کچھ بچوں کی دلچسپی کی ٹافیاں وغیرہ اپنی صدری کی جیب میں رکھ کر جاتے۔ان کے کاکوری پہنچتے ہی اس وقت کے بچے ان کے گرد اباجان آگئے، اباجان آگئے کا شور مچاتے ہوئے جمع ہوجاتے تھے۔اور والدصاحب بچوں سے ان کی عمر اور بساط کے مطابق کچھ ہلکے پھلکے سوالات کرتے جاتے اوران کے جوابات سے خوش ہوکر حوصلہ افزائی کے لئے انہیں لکھنؤ سے لائے انعامات میں سے کچھ نہ کچھ دیتے جاتے — ایسے ہی ایک موقع پر والدصاحبؒ کاکوری سے واپس آئے تو نہ صرف بہت رنجیدہ تھے بلکہ ایک فکر وتشویش لے کر واپس آئے تھے، جس کا اظہار انہوں نے اپنے سب سے بڑے بھتیجے اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالغفور صاحب مرحوم کے اکلوتے بیٹے

مولانا عبدالاول صاحب فاروقیؒ سے کیا۔چوں کہ بھائی جان مرحوم کے بھی ننھیالی رشتہ دار کاکوری میں رہتے تھے، اس لئے ان کا بھی کاکوری آنے جانے کا سلسلہ دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ تھا۔یہی وجہ تھی کہ کاکوری اور وہاں کے رشتہ داروں سے متعلق اکثر معاملات میں والدصاحبؒ ان ہی سے مشاورت کرتے تھے — پھر یوں بھی بھائی جان مرحوم رشتے میں تو ظاہر ہے کہ والدصاحب کے بھتیجے اور میرے بڑے بھائی ہی تھے، لیکن ہمارے درمیان عمروں کا اتنا فاصلہ تھا کہ بھائی جان مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے عبدالاعلیٰ مرحوم مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔عمروں کا تفاوت کم ہونے کی وجہ سے بھی والدصاحبؒ کو ان سے مشاورت میں سہولت رہتی تھی۔

چنانچہ والدصاحبؒ نے بھائی جان مرحوم سے کہا کہ عبدالاول! اس مرتبہ کاکوری سے بہت رنجیدہ اور فکرمند واپس آیا ہوں۔میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس تشویش کا ازالہ کیسے ہو؟ ہوا یہ کہ میں نے اپنے گھر کے بچوں (ان کے والدین کے ناموں کے حوالے دے کر) سے بہت ہی ہلکے پھلکے، لیکن بنیادی حیثیت کے سوالات کئے تو بچے ان کے صحیح جوابات نہیں دے سکے؟ حتیٰ کہ میں نے دو تین چھوٹے بچوں سے کلمہ طیبہ پڑھوایا تو وہ صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکے — جب ہمارے گھر اور خاندان کا یہ حال ہے تو کاکوری کے دیگر مسلم گھرانوں اوران کے بچوں کا کیا حال ہوگا؟۔کیا ہم سے سوال نہ ہوگا کہ تم لوگ دنیا میں پھر پھر کر تبلیغ دین کیا کرتے تھے، اور خود تمہارے گھر اور خاندان کا یہ حال تھا کہ بچے کلمہ تک صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے

تھے —— پھر تلاوت قرآن اور نمازوں وغیرہ کے سلسلہ میں تو پوچھنا ہی کیا؟ پھر انہوں نے بچوں کی عمریں بتا بتا کر کہا کہ فلاں بچے کی عمر ۸ ربرس کی ہوگئی ہے مگر ابھی وہ قاعدہ بغدادی ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ اور فلاں بچہ ۱۰ ربرس کا ہوکر بھی ابھی ناظرہ قرآن مکمل نہیں کر سکا ہے۔ عام طور پر بچوں بچیوں کو پوری نماز کا صحیح طریقہ بھی نہیں معلوم ہے —— یہ سوچو کہ یہ بچے کن بزرگوں اور اہل اللہ کی اولاد ہیں، اور ان کے جسموں میں کون سا خون گردش کر رہا ہے؟۔ ہمیں اپنی ''اس غفلت'' کی تلافی کے لئے کوئی کوشش ضرور کرنا چاہئے —— ورنہ حشر کے دن ہمارا عالم اور مبلغ ہونا کام نہ آئے گا۔

بھائی جان مرحوم نے والد صاحبؒ کی پوری بات بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ سننے کے بعد والد صاحب سے کہا کہ چچا جان! اس کا ایک ہی علاج یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ اپنے آبائی گھر کے باہری کمرہ میں یا پھر دروازہ پر موجود مسجد میں ایک دینی مکتب قائم کیا جائے، جس میں اپنے گھر کے بچوں کے ساتھ ساتھ کاکوری کے دوسرے مسلم گھرانوں کے بچوں کو بھی محنت کر کے لایا جائے اور انہیں ''مبادیات دین'' کی تعلیم دی جائے —— اور یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ نہ میرے بس میں ہے نہ ہی خاندان کے کسی دیگر فرد کے بس میں ہے۔ البتہ آپ کی رہنمائی میں مجھ سے جو بن سکے گا تعاون ضرور کروں گا —— کسی اور سے اس کی بھی امید نہ رکھئے۔

مجھے یاد ہے کہ پھر اس کے بعد سے بھائی جان کی میرے گھر آمد و رفت بڑھ گئی تھی، اور جب آتے تو والد صاحب سے مکتب کے قیام کا

مطالبہ کرتے۔ ادھر والد صاحب پر اپنے بڑے ابا کے قائم کئے ہوئے ادارہ ''دارالمبلغین'' کے انتظام و انصرام سے لے کر مالیات کی فراہمی تک اتنی بڑی ذمہ داری تھی کہ انہیں سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ ویسے تو دارالمبلغین سے ہمارے دوسرے بھی کئی خاندانی بزرگوں، خصوصاً حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ کی بہ حیثیت صدر مدرس وابستگی تھی، لیکن عملی طور پر حساب کتاب، انتظام و انصرام، اور سرمایہ کی فراہمی کی تمام تر ذمہ داری والد صاحب کی تھی، جس کے لئے انہیں بیرون شہر کلکتہ و بمبئی سے لے کر اتر پردیش کے متعدد اضلاع کے سفر بھی کرنا پڑتے تھے۔ خصوصاً پورے رمضان المبارک میں تو ان کا یہ حال رہتا کہ بہ مشکل تمام دو چار افطار و سحر ہی گھر میں کر پاتے۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ان کی عید بھی اپنے بال بچوں اور گھر سے دور بمبئی میں ہوگئی؟ ایسے میں انہیں کہاں اس کی مہلت تھی کہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہو پاتے؟ —— انہوں نے غالباً بھائی جان کے سامنے کاکوری کے بچوں کے دینی احوال کا ذکر اس لئے کیا ہوگا کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ کریں تو والد صاحب بھی حسب گنجائش انہیں اپنا تعاون دے دیں؟۔ مگر جب بات الٹ گئی، اور والد صاحب کی اس سلسلہ میں تشویش و فکرمندی برقرار رہی تو مجبوراً (اللہ کے بھروسے پر) انہوں نے اپنے آبائی مکان کے باہری کمرہ میں ایک مکتب قائم کر دیا۔ اور اس میں تعلیم دینے کے لئے اپنے مرحوم والد کے ایک دوست اور ریٹائرڈ ٹیچر ماسٹر معتصم الدین صاحب مرحوم کی خدمات حاصل کرتے ہوئے ان کا تقرر پینتیس روپے کا ماہانہ تنخواہ پر کر لیا اور جذبۂ

اخلاص و بے قراری دیکھئے کہ یہ رقم وہ اپنی مدرسہ دارالمبلغین سے ملنے والی ڈھائی سو روپئے ماہانہ تنخواہ میں سے عرصہ دراز تک دیتے رہے۔ پھر جب اپنے خاندانی بچوں کے ساتھ کاکوری کے دیگر مسلم گھرانوں کے اس مکتب میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد اتنی ہوگئی کہ ان سب کو سنبھالنا اور پڑھانا ایک بوڑھے اور ریٹائر مدرس کے بس میں نہیں رہا تو والد صاحبؒ نے کاکوری کے اپنے چند مخلص احباب کی مشاورت سے ایک باقاعدہ مدرسہ کے قیام کا ایک مطبوعہ پمفلٹ کے ذریعہ اعلان کرتے ہوئے ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء کے ماہ محرم الحرام کی کسی تاریخ میں مقامی لوگوں کا ایک چھوٹا سا اجتماع کرکے اس کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کے بعد تو اخلاص کی برکت سے حق تعالیٰ کی مدد آنا شروع ہوگئی۔ اور کچھ یوں ہوا کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میری دارالعلوم دیوبند سے فراغت دورۂ حدیث شریف کے بعد واپسی پر جب ۵؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو انہوں نے دارالعلوم فاروقیہ نامی اپنے قائم کردہ مدرسہ کی ذمہ داریاں میرے سپرد کیں، اس وقت مدرسہ میں تین درجات پرائمری کے ساتھ ہی، درجہ حفظ، اور ایک درجہ عربی وفارسی کا قائم ہوچکا تھا۔ مدرسہ میں پانچ مدرسین کا عملہ تھا، اور گھر کے باہری کمرہ کے علاوہ گھر ہی سے متعلق باہری افتادہ وسیع زمین پر لکھوری اور مٹی کے گارے سے چار درس گاہوں کی بھی تعمیر ہوچکی تھی۔ جن پر مالی تنگی کی وجہ سے لکھنؤ کے ایک

اپنے ہی انگلش اسکول سے نکلی ہوئی سیمنٹ کی پرانی چادریں بطور چھت اور وہیں سے نکلے ہوئے پرانے دروازے خرید کر لگائے گئے تھے۔ ۱۰-۱۵؍ کی تعداد میں حفظ قرآن اور عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کرنے والے بیرونی طلبہ بھی تھے۔ جن کا قیام ان ہی کمروں میں تھا، جن میں دن کے وقت پڑھائی ہوتی اور رات میں یہ بیرونی طلبہ وہیں سوتے۔ ان بیرونی طلبہ کے کھانے کا تو انتظام مدرسہ کی طرف سے ہوتا تھا، لیکن مدرسہ میں باقاعدہ کوئی مطبخ اور اس کے لئے باورچی نہیں تھا۔ بلکہ ان بچوں کے لئے دونوں وقت کھانا پکانے کی ذمہ داری میری سنجھلی پھوپھی صاحبہ مرحومہ نے اٹھا رکھی تھی، جو اپنے اسی آبائی مکان میں رہتی تھیں اور ان کے شوہر یعنی میرے پھوپھا سید محمد عبدالوکیل صاحب بھی مدرسہ کے درجات پرائمری کے ایک استاذ تھے۔ گھر کے باہر اسی افتادہ زمین کے ایک حصہ میں تعمیر شدہ برسہابرس سے غیر آباد مسجد نمازیوں سے آباد ہوچکی تھی۔ اور اسی مسجد سے ملحق ایک کمرہ میں درجہ حفظ کے استاذ قاری محمد حبیب الرحمن صاحب کی سکونت تھی۔ جو ضلع دربھنگہ (بہار) کے رہنے والے مدرسہ دارالمبلغین کے ایک قدیم طالب علم تھے۔ اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے درجہ تجوید سے فراغت کے بعد والد صاحب نے ان کا تقرر کرکے انہیں کاکوری بھیج دیا تھا۔ جب کہ درجہ عربی وفارسی سے وابستہ ایک دوسرے بیرونی مدرس مولانا رفیق احمد قاسمی اعظمی کاکوری کے سب سے بڑے مسلم محلہ کی ایک مسجد کے امام ہوکر وہیں سکونت پذیر تھے۔ بقیہ اساتذہ مقامی یا آس پاس کے مواضعات کے تھے جن کا روزانہ آنا جانا تھا۔

میری مدرسہ سے وابستگی کے بعد جس تیز رفتاری سے مدرسہ کی ترقی ہوئی۔ والد صاحب کی حیات ہی میں پرائمری درجات کے ساتھ ہی چار درجات حفظ اور درجات عربی میں مشکوٰۃ شریف کی جماعت تک تعلیم کا باقاعدہ نظم، ان طلبہ کے سالانہ امتحانات کے لئے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد، مدرسہ مدینۃ العلوم رسولی بارہ بنکی، اور مدرسہ دارالرشاد بنکی، بارہ بنکی وغیرہ کے بڑے اساتذہ کی آمد۔ مدرسہ میں بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا باقاعدہ نظم اور مطبخ کے لئے دو باورچیوں کا تقرر، وسط قصبہ کے محلہ قلعہ میں واقع ایک وسیع اراضی کی خریداری اور اس پر متعدد درس گاہوں کی تعمیر۔ اور سطور بالا میں مذکور میری اور میرے نوجوان ساتھیوں کی تمام سرگرمیاں، دراصل والد ماجدؒ کے اسی اخلاص نیت، اور عنداللہ مقبولیت کا ثمرہ تھیں اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے والد ماجد اور مدرسہ کی بانی کو کروٹ کروٹ چین عطا فرمائے۔ (آمین)

۳۔ ۴؍جون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں والد ماجدؒ کی وفات، اور ہم سب کی ان کی گراں قدر سرپرستی سے محرومی کے بعد مدرسہ میں جو تعلیمی وتعمیری وسعتیں ہوئیں، انہیں دیکھ کر جب جب احباب نے ان کا کریڈٹ مجھے یا میرے بھائیوں کو دیتے ہوئے ہماری جہد مسلسل کی تعریف کی تو میں نے یہی جواب دیا کہ یہ سب کچھ بانی کے اخلاص نیت کا ثمرہ ہے، جنہوں نے اپنا خون جگر شامل کر کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ہم لوگ تو بس ان کی تعمیر کا رنگ روغن کرا کے اسے خوبصورت اور جاذب نظر بنانے والوں کی طرح ہیں۔ اور

اسی پر تعریف ہماری ہو رہی ہے۔ جب کہ کسی بھی عمارت کے لئے اس کی بنیاد مرکزی حیثیت رکھتی ہے، جس کے اوپر عمارت کھڑی کی جاتی ہے — اور بنیاد کی اینٹ زمین کے اندر دفن ہو جاتی ہے جسے نہ کوئی دیکھتا ہے نہ اس کی تعریف کرتا ہے۔ تعریفیں تو اس پر بنی ہوئی عمارت اور اس کی سجاوٹ کی ہوتی ہیں؟؟

سدا رہے نام اللہ کا

دارالعلوم فاروقیہ کی کچھ غیر تدریسی سرگرمیاں:

اپنی کتاب زندگی کے بس ایک ہی پر امید عنوان خدمت ''دارالعلوم فاروقیہ'' اور اس سے وابستہ یادوں کے تفصیلی تذکرہ کا اختتام کچھ ایسے دل کش واقعات کے ذکر سے مناسب سمجھتا ہوں جنہیں پڑھ کر اس طویل تحریر سے اکتائے ہوئے قارئین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر جائے۔ اور ان کے منھ سے بے ساختہ میرے لئے کچھ ایسے دعائیہ کلمات نکل جائیں جو مجھ آلودۂ عصیاں کے لئے مغفرت ونجات کا ذریعہ بن جائیں۔

(۱) ہماری بے تکلف و دوستانہ مجلس احباب میں ایک دن یہ طے پایا کہ ہفتہ میں ایک دن کسی ایک ممبر کی طرف سے باری باری تمام ممبران کی چائے ''مع وائے'' کا نظم کیا جائے، تاکہ سب لوگ مل بیٹھ کر گزشتہ وآئندہ کے سلسلہ میں کچھ بات چیت بھی کر لیں اور کچھ کھانا پینا بھی ''بہ شکل دعوت'' ہو جائے۔ اس کے لئے جمعرات کو بعد نماز ظہر کا وقت اس لئے طے پایا کہ صبح سے دو پہر، اور پھر بعد نماز ظہر تا اذان عصر دو نشستوں میں تعلیمی نظام رکھنے

والے مدارس میں جمعرات کے دن پہلی ہی نشست میں تعلیمی گھنٹوں کا وقفہ کم کر کے تعلیم ہوتی، اور بعد نماز ظہر طلبہ واساتذہ کی چھٹی رہتی، تاکہ قرب وجوار کے طلبہ واساتذہ اپنے گھروں میں جا کر شب جمعہ سے جمعہ کے پورے دن قیام کر سکیں۔ اور پھر جمعہ کو نماز مغرب سے قبل مدرسہ واپس آ کر اگلے دن کے اسباق کے لئے حسب معمول تیاریاں کر سکیں۔ ہمارا مدرسہ بھی اس وقت دو نشستوں میں تعلیم والا تھا۔ اور عام دنوں میں ۵۰-۵۰ منٹ کی تعلیمی گھنٹیاں۔ اور جمعرات کے دن ۳۵-۳۵؍منٹ کی تعلیمی گھنٹیاں ہوتیں۔ پھر نماز ظہر کے بعد سے دوسرے دن جمعہ کو نماز مغرب تک کے لئے چھٹی ہو جاتی۔ اس طرح جمعرات کو بعد نماز ظہر تا عصر کا وقت فارغ رہتا۔ جس میں مختلف ادوار میں مختلف قسم کی غیر تعلیمی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

بہر حال اس طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلی جمعرات کو قاعدہ سے میری طرف سے اس ''دعوت احباب'' کا انتظام ہونا چاہئے تھا۔ کیوں کہ میں صدر مدرس تھا۔ مگر ہوا یہ کہ درجات پرائمری میں کاکوری کے ایک معزز علوی خانوادہ کے استاذ جناب ناظم حسین صاحبؒ نے باصرار مجھ سے کہا کہ پہل میں کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے بڑے حوصلہ کے ساتھ طرح طرح کے پکوان کے ساتھ ایسی شاندار ''دعوت احباب'' کا انتظام کیا کہ دوسرے تمام ممبران بھی ''بہت کچھ سوچنے'' پر مجبور ہو گئے؟۔ اگلی جمعرات کو میرا نمبر آیا، اور پھر میں نے ''اپنی عزت بچانے'' کے لئے اپنی بساط بھر جتن کئے۔ اس کے بعد ترتیب کے حساب سے جن صاحب کا نمبر تھا انہوں نے اپنے نمبر

سے مؤخر کئے جانے کی بات کہی، جسے خوشی خوشی منظور کرتے ہوئے ایک دوسرے، اور پھر اس کے بعد ایک تیسرے صاحب اپنے حوصلہ کے مطابق پر تکلف دعوت کا اہتمام کرتے رہے اور یہ صاحب ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی عذر کر کے اپنا نمبر آگے بڑھاتے رہے۔ اس وقت جب ہم ۸-۱۰؍ممبران میں سے نصف تعداد نمٹ گئی تو قاری محمد حبیب الرحمن صاحب نے ایک دن چپکے سے مجھ سے کہا کہ مجھے ان کی نیت میں کھوٹ لگتا ہے، اس لئے میرا نمبر ان کے بعد ہی رکھئے گا۔ قاری صاحب سے ان کی کچھ چشمک بھی چلتی تھی، اس لئے انہیں مطمئن کرنے کے لئے میں نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ سب کی کھا کر خود نہ کھلائیں۔ قاری صاحب بولے کہ کھلائیں گے تو، مگر دیکھئے گا کہ کیا کھلائیں گے؟ اور میں اسی کے مطابق بعد میں کھلاؤں گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ باصرار تمام جب انہوں نے آخر میں (قاری صاحب سے پہلے) کھلانا پلانا طے کیا، تو دو تبدیلیاں کیں۔ پہلی یہ کہ مدرسہ کے بجائے سب کو اپنے گھر پہنچنے کا پابند کیا۔ دوسری یہ کہ اب تک کی روایت سے ہٹ کر کچھ ایسا ناشتہ کرایا جس سے ہم سب نے محسوس کیا کہ یہ بے دلی کے ساتھ ایک ''جبری رسم'' کی ادائیگی ہوئی ہے ——— اور پھر جواب میں اگلے ہفتہ قاری صاحب نے اپنے پلان کے مطابق وہ ناشتہ کرایا جس سے ہمارے ''ساتوں طبق'' روشن ہو گئے۔ بس اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ قاری صاحب نے ناشتہ میں چائے میں بھگو کر کھائے جانے والے سیلے ہوئے بسکٹ بھی رکھے تھے؟۔ حالاں کہ قاری صاحب نے اپنی اس ''انتقامی کارروائی'' کے بعد بار بار اور بہت

ہی شدومد کے ساتھ ''اپنے حریف کے سوا'' باقی تمام ممبران کو ''دعوت خاص'' کی پیش کش کی ـــــ مگر سب کے دل کھٹے ہو گئے تھے۔اور ناظم حسین صاحب مرحوم کے شروع کئے ہوئے اس ''شاندار سلسلۂ خیر'' کا اختتام پہلے ہی دور پر ہو گیا۔

(۲) مدرسہ کے ایک ''دھان پان جثہ والے'' عالم وفاضل استاذ کو نہ جانے کس خطا پر اپنے ایک شاگرد سے ایسی تکلیف پہنچی کہ وہ اسے ڈانٹتے ڈپٹتے ہوئے قابو سے باہر ہو گئے۔ان کی گھن گرج کی آواز سن کر ہم چند اساتذہ وطلبہ ان کے رہائشی کمرہ کے باہر جوں ہی پہنچے، عالم وارفتگی میں ان کی لنگی کمر سے سرک کر نیچے آ گئی۔اس مسخرہ خیز منظر کو دیکھتے ہی میرے بھانجے اور مدرسہ کے استاذ مولانا عبدالمنان قاسمی مرحوم نے برجستہ بآواز بلند شمیم جے پوری مرحوم کا مصرع ؏

اصل میں اب ہوئی ہے اہم زندگی

پڑھا تو موصوف کا غصہ تو کافور ہوا ہی۔قہقہوں کے بیچ اس طالب علم کی گلوخلاصی بھی ہو گئی۔

(۳) مدرسہ کے لائق استاذ مولانا غلام محمد صاحب بہت ہی نیک اور سیدھی سادی دیہاتی وضع قطع والے آدمی تھے۔وہ پابندی کے ساتھ دیہاتی انداز کا ''نیوکٹ'' کہا جانے والا جوتا پہنتے تھے۔جب کہ میں ''جوانی کی ترنگ میں'' مولویانہ فیشن کرتے ہوئے عموماً جے پوری یا پھر لکھنوی ناگرہ پہنا کرتا تھا۔ایک دن میں نے مولانا سے کہا کہ یہ کیا آپ لکھنؤ میں رہ کر بھی

دیہاتی بنے رہتے ہیں؟ اپنا یہ جوتا اب والد صاحب یا نانا صاحب کو دیدیجئے۔اور میری طرح کا ناگرہ جوتا پہنا کیجئے۔جواب میں مولانا نے مسکراتے ہوئے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ کہا، آپ ہی کی طرح کا تو میرا بھی جوتا ہے۔بس ذرا سا فرق یہ ہے کہ میرے جوتے میں اوپر ایک پٹی لگی ہے جو آپ والے میں نہیں ہے۔ذرا سا فرق یہ بھی ہے کہ میرا والا آگے سے گول سے اور آپ والا ذرا پھیلا ہوا ہے۔اور آپ والے میں یہ جو کام بنا ہوا ہے وہ مجھے پسند نہیں ہے۔باقی جیسا آپ کا جوتا ہے ویسا ہی تو میرا بھی ہے۔

اس ''جواب باصواب'' پر میں کھسیا کر خاموش ہو گیا ــــ کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا؟۔جب کہ مولانا پوچھتے ہی رہ گئے کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ خاموش کیوں ہو گئے؟

ایسے اور بھی کچھ دلچسپ چٹکلے یاد آ رہے ہیں۔مگر قارئین کے ملال کے اندیشے سے بات اسی جگہ ختم کر رہا ہوں۔

جاری ہے زندگی کا سفر

کن کن منزلوں سے گذر گئے؟

یوں تو جیسے تیسے بن سکے میرے اب تک کی زندگی کے — تین مشغلے رہے ہیں۔ تدریس اور اس حوالہ سے دارالعلوم فاروقیہ۔ تقریر وخطابت۔ اور البدر کی لازمی پابندی کے علاوہ اور بھی کچھ پڑھنے لکھنے کا شغل — مگر میں نے پہلے مشغلہ کو ہمیشہ ترجیح دی۔ اس میں کچھ تو اپنی علمی ضرورت کی تکمیل کا جذبہ شامل رہا، اور کچھ دارالعلوم فاروقیہ سے جذباتی لگاؤ اور تعلق۔

اس سلسلہ کے دو ناخوشگوار واقعات بھی یاد آگئے، جن کو ڈرتے ڈرتے اس جگہ نقل کر رہا ہوں۔ کیوں کہ اندیشہ یہ ہے کہ قارئین میں سے کچھ لوگ اس کو ''کبر ونخوت'' کا ثمرہ نہ قرار دے لیں۔ حالاں کہ اللہ گواہ ہے کہ اس ''مرض'' سے بچنے کے لئے میں دعائے نبوی ''**اللّٰھم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناس کبیراً** (اے اللہ مجھے خود اپنی نگاہ میں چھوٹا اور دوسروں کی نگاہ میں بڑا بنا دے) کا بھی سہارا لیتا ہوں۔ اور عام رویہ میں اس ''الزام'' سے بچنے کا میں اتنا اہتمام کرتا ہوں کہ بسا اوقات ''میری واقعی حیثیت'' بھی مجروح ہونے لگتی ہے؟ میرے بعض مخلص احباب

نے مجھے اس طرف متوجہ بھی کیا، خصوصاً میرے ایک دیرینہ رفیق درس اور دارالعلوم فاروقیہ کے سینئر ولائق استاذ مولانا فضل الرحمن گونڈوی صاحب مرحوم نے تو باقاعدہ مجھے سمجھانے اور ''راہ راست'' پر لانے کی کئی مرتبہ کوشش کی، جسے میں نے ہنسی میں اڑا دیا۔

بہر حال میں ان دونوں واقعات کو اس امید کے ساتھ نقل کر رہا ہوں کہ درج بالا تمہید کے بعد شاید قارئین مجھے ''کبر کے الزام'' سے بری رکھیں — پھر بھی اندیشہ تو ہے ہی؟ پہلا واقعہ ۱۹۸۰ء کا ہے جس کا تعلق ہمارے مشرقی دیار کے معروف وبافیض مدرسہ بیت العلوم سرائے میر (بانی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ۔ خلیفہ اجل حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) کے سالانہ اجلاس میں بہ حیثیت خطیب شرکت سے ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب مدرسہ بیت العلوم کے (برائے نام) ناظم حاجی محمد نذیر صاحب تھے۔ جن کا مستقل قیام ملیشیا میں رہتا تھا۔ البتہ مدرسہ سے وہ اپنا تعلق بنائے رکھتے تھے۔ جب کہ مدرسہ کے سرپرست محی السنۃ حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ ہردوئی تھے۔ پھر خود اندرون مدرسہ وہاں کے تدریسی عملہ سے وابستہ علماء میں کم از کم دو بہت اہم وبزرگ شخصیتیں حضرت مولانا عبدالقیوم صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ شامل تھیں۔ جن کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں تھی (بہت بعد کے بننے والے ناظم حضرت پھولپوریؒ کے حفید مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحبؒ اس وقت مدرسہ کے ایک کم

سن طالب علم تھے، جو اپنے پھوپھا یعنی حضرت پھولپوریؒ کے داماد اور میرے خاص کرم فرما جامؔ صاحب مرحوم کے ساتھ لگے لپٹے رہتے تھے) اس کے باوجود مدرسہ بیت العلوم کے اس وقت طلبہ واساتذہ اور بڑی تعداد میں جلسہ میں شرکت کرنے والے قرب وجوار کے عوام، اور پھر ان سب کے بڑے و سرپرست حضرت مولانا عبدالقیوم صاحبؒ کی خواہش واصرار پر مجھے ہر سال بیت العلوم کے اس اجلاس میں شرکت کے لئے ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔ اور میں بھی اسے اپنے لئے باعث فخر سعادت سمجھ کر پابندی کے ساتھ شرکت کیا کرتا تھا۔ وہاں میری اپنی حیثیت سے بڑھ کر پذیرائی بھی ہوتی اور بزرگوں کی دعائیں بھی ملتیں۔ پھر یوں بھی اس مدرسہ اور اس کے ہونے والے سالانہ جلسوں سے مدرسہ کے بانی کی نسبت سے میرا ''موروثی رشتہ'' رشتہ تھا۔ کیوں کہ بانی مدرسہ حضرت پھولپوریؒ کی خصوصی دعوت پر دیگر خاندانی بزرگوں کے علاوہ میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ کی بھی برابر شرکت ہوتی رہی تھی۔

مجموعی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدرسہ بیت العلوم سرائے میر میں حاضری باعث مسرت واعزاز تو ہوسکتی تھی، کسی طرح باعث کلفت نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر ۱۹۸۰ء کے جس جلسہ کے حوالہ سے میں اپنی ''آپ بیتی'' سنانے جا رہا ہوں، اس کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔

ہوا یوں کہ دوروزہ منعقد ہونے والے جلسہ کی رات ودن کی مختلف نشستوں میں سے مجھے ایک رات کی نشست میں شرکت کی دعوت ملی۔ اپنی

ہر قیمت پر مدرسہ حاضری اور حتی المقدور اسباق کا ناغہ نہ ہونے کی غرض سے میرا معمول یہ تھا کہ قریب کی ایسی جگہوں پر جہاں سے کسی بھی طرح اور کسی بھی سواری سے تقریر کے بعد اگر اپنے مدرسہ کے اوقات تعلیم میں واپس آجانا ممکن ہوتا تو میں جلسہ میں شرکت کے لئے یہ شرط لگا دیتا تھا کہ تقریر کے بعد ریلوے اسٹیشن یا بس اسٹینڈ تک (جس سواری سے بھی ممکن ہوسکتا تھا) جلسہ کے ذمہ داران میری واپسی کا نظم کریں گے۔ جو لوگ میری یہ شرط منظور کرتے میں ان ہی کے جلسہ میں شرکت کرتا۔ چنانچہ مدرسہ بیت العلوم کے جلسوں میں بھی یہی طے رہتا تھا، اور جب بھی میری شرکت رات کی نشست میں ہوتی۔ میری تقریر کے بعد ذمہ داران مجھے کبھی مدرسہ سے چند کلومیٹر پر واقع ''کھریواں موڑ'' پر جہاں سے لکھنؤ کے لئے روڈویز کی بسیں مل جایا کرتی تھیں، یا پھر شاہ گنج ریلوے اسٹیشن پر جہاں سے عموماً سیالدہ ایکسپریس ٹرین مل جاتی تھی (جس میں بھی جانبین کے لئے سہولت ہوتی) بھیج دیا کرتے تھے۔ اس وقت مدرسہ بیت العلوم اور خود میری حیثیت یہ تھی کہ نہ مدرسہ کے پاس اپنی کوئی گاڑی تھی، نہ میں اس حیثیت کا حامل تھا کہ اپنی نجی یا کرایہ کی گاڑی سے سفر کرتا۔ بس عام طریقہ پر ریلوں یا بسوں سے سفر ہوا کرتا تھا۔ اس لئے ضرورت ہوتی تھی کہ جلسوں کے منتظمین سے پہلے سے کہہ دیا جائے کہ وہ واپسی کے لئے سواری کا نظم کردیں۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق جلسہ ختم ہونے کے بعد بیت العلوم کے ذمہ داروں کو مجھے شاہ گنج ریلوے اسٹیشن بھیجنا تھا تاکہ میں صبح ۸:۳۰ بجے لکھنؤ پہنچ کر کچھ تاخیر سے

مدرسہ کے اوقات تعلیم کے اندر مدرسہ پہنچ جاؤں۔ مگر اللہ جانے کیا وجہ ہوئی کہ میں نے جب واپسی کا ارادہ ظاہر کیا، تو وہاں کے کچھ چھوٹے درجہ کے ذمہ داروں نے جو اس وقت موجود تھے، سواری نہ ہونے کا عذر پیش کر کے میری واپسی کا انتظام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ''نئی افتاد'' سے مجھے غصہ آ گیا، اور میں یہ کہہ کر مدرسہ کے گیٹ سے باہر نکلنے کے لئے آمادہ ہو گیا کہ مجھے واپس تو بہر حال اسی وقت جانا ہے، چاہے کھریواں موڑ تک (جو کئی کلو میٹر کے فاصلہ پر تھی) پیدل ہی جانا پڑے۔ میرے اس ''اعلان جنگ'' سے وہ لوگ گھبرا گئے، جس کی اطلاع بڑے ذمہ داروں کو دی گئی۔ پھر کسی طرح میری واپسی کے لئے سواری کا انتظام کیا گیا (اب یہ یاد نہیں رہ گیا کہ سواری کیا تھی؟ اور میری واپسی کہاں تک ہوئی تھی؟) بہ ہر حال میں صبح کو واپس آ کر تعلیمی وقت کے اندر ہی مدرسہ پہنچ گیا تھا۔

بعد میں کسی طرح یہ اطلاع ملی تھی کہ میری واپسی کے لئے نظم یہ کیا گیا تھا کہ کوئی ''کار نشین صاحب'' جلسہ میں شرکت کے لئے آنے والے تھے، جو جلسہ ختم ہونے کے بعد واپس جاتے۔ ان ہی کی کار پر مجھے واپس جانا تھا۔ مگر کسی وجہ سے وہ صاحب نہیں آئے تو سارا پروگرام ہی درہم برہم ہو گیا ——اور اب ''اپنے اس نظم'' کی اطلاع نہ دے کر ذمہ داروں نے حسب سابق بس مجھے جلسہ کے بعد واپس بھیجنے کی یقین دہانی کرا دی تھی؟

دوسرا واقعہ بستی شہر سے کم و بیش ۲۵ رکلومیٹر دور ''دودھارا'' نامی بستی سے تعلق رکھتا ہے، جہاں کے ایک ذمہ دار استاذ مولانا محمد اسرائیل صاحب

ایک دوسرے رفیق کے ساتھ میرے گھر اپنے مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کا وعدہ لینے کے لئے آئے تھے۔ چوں کہ ضلع بستی کے متعدد مقامات پر مجھے ''خراب تجربات'' ہو چکے تھے، اس لئے ابتداءً میں نے شرکت سے انکار کرتے ہوئے ان حضرات سے معذرت کر لی۔ مگر وہ تو جیسے ہر قیمت پر شرکت کا وعدہ لینے کا عزم مصمم لے کر آئے تھے، اس لئے ان کے شدید اصرار پر میں نے شرکت کے لئے یہ شرط رکھی کہ آپ لوگ صبح ۶ ربجے سے پہلے مجھے ہر قیمت پر بستی ریلوے اسٹیشن پہنچا دیں گے۔ تا کہ میں وہاں سے صبح ۶ ربجے لکھنؤ کے لئے آنے والی ٹرین سے واپس آ جاؤں۔ جس کا انہوں نے پختہ وعدہ کر لیا۔ میں نے پچھلے تجربات کے حوالہ سے وعدہ خلافی کا اندیشہ ظاہر کیا تو انہوں نے کہا کہ جاتے وقت بستی اسٹیشن سے جس گاڑی سے آپ جائیں گے، وہ وہیں کھڑی رہے گی اور آپ کو واپس لے کر ہی آئے گی۔

گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے وقت میں اتنی گنجائش تھی کہ نماز فجر کے بعد ہلکا پھلکا چائے ناشتہ کر کے بھی وہاں سے روانگی ہوتی تو آسانی کے ساتھ ٹرین کے وقت سے کافی پہلے بستی ریلوے اسٹیشن پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لئے وعدہ اور یقین دہانی پر اعتماد کرتے ہوئے میں مقررہ تاریخ میں ٹرین کے ذریعہ لکھنؤ سے صبح کے وقت روانہ ہو کر لگ بھگ ۲ ربجے دن میں بستی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں کئی حضرات میرے استقبال کے لئے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ جو مجھے اپنے ہمراہ ایک جیپ پر سوار کر کے ایک گھنٹہ کے اندر ہی دودھارا پہنچ گئے۔ یہ جیپ کرایہ پر چلنے والی ٹیکسی تھی جس کا نوجوان

ڈرائیور بہت خوش مزاج تھا۔ راستہ میں اس سے خوشگوار موڈ میں باتیں ہوتی رہیں، جس کی وجہ سے اس سے ایک انس بھی پیدا ہو گیا۔ مدرسہ سے متصل مسجد کے باہر میدان میں مجھے اتارا گیا، اور بتایا گیا کہ واپسی کے وقت نماز فجر سے پہلے جیپ اسی جگہ کھڑی ملے گی۔ میں مطمئن ہو کر مدرسہ میں گیا، جہاں لوگوں سے ملنے ملانے اور کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر نصف شب میں جلسہ ختم ہونے کے بعد آرام کرنے کے لئے وہیں واپسی ہوئی۔ صبح کو نماز فجر کے لئے مسجد گیا تو علم ہوا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد رات میں ہلکی بارش ہونے کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد واپس آتے ہوئے حسب وعدہ مقررہ مقام پر جیپ نہ پا کر میرا ماتھا ٹھنکا—— اور مدرسہ واپس آکر میں نے فوری طور پر موسم کے حوالہ سے اپنی واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو لوگ ادھر ادھر ہونے لگے۔ میرے گھر پہنچ کر مدعو کرنے والے مولانا اسرائیل غائب تھے۔ دوسرے لوگ بھی ٹال مٹول کر کے کوئی صاف جواب نہیں دے رہے تھے۔

ان لوگوں کے اس رویہ سے میری تشویش بڑھ رہی تھی اور مجھے ''دال میں کالا'' نظر آنے لگا تھا۔ بالآخر میرے اصرار پر ایک ''مولوی شکل وصورت کے نوجوان'' نے بتایا کہ ڈرائیور نے دھوکا دیا اور وہ جیپ لے کر بھاگ گیا۔ اتنا سنتے ہی میری ساری ''خوش فہمی'' کافور ہو گئی۔ اور یہ سوچ کر کہ اب میرا شام سے پہلے کسی صورت میں لکھنؤ پہنچنا نہ ہو سکے گا، سخت اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں مولانا اسرائیل کے بارے میں

پوچھا تو اس نوجوان نے کہا کہ ''وہ غیرت کی وجہ سے آپ کا سامنا نہیں کر پا رہے ہیں'' جس کے جواب میں میں نے کہا ''تو کیا اس جگہ سب سے بڑے بے غیرت تم ہی تھے کہ تمہیں یہ بتانے کے لئے بھیجا گیا ہے؟—— بہر حال میری یہاں سے واپسی کا کسی بھی طرح کا انتظام کرو، اب میں یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی رکنا گوارہ نہیں کرتا ہوں۔ تم لوگ اسی طرح جھوٹے وعدے کر کے پریشان کرنے کے عادی ہو—— وغیرہ وغیرہ''۔

میری اس گفتگو کو دور بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سن رہے تھے۔ جو اس مرحلہ پر مسکراتے ہوئے میرے قریب آئے۔ اور بہت ہی نرم لہجہ میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا، اچھا اب غصہ تھوک دیجئے اور ناشتہ کیجئے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ میں آپ کی واپسی کا مناسب نظم کروں گا۔ میں چوں کہ ان بزرگ سے واقف نہیں تھا۔ اپنی وضع قطع سے وہ کوئی عام دیہاتی آدمی لگ رہے تھے۔ اس لئے میں نے ان سے کہا، آپ کیا انتظام کریں گے، جب ذمہ دار حضرات ہی اس طرح منھ چوری کر رہے ہیں تو مجھے خود ہی کچھ سوچنا پڑے گا۔ جہاں تک سواری نہ ملے گی میں پیدل چلنا گوارہ کر لوں گا۔ مگر اب نہ یہاں رکنا ہے نہ ناشتہ وغیرہ کرنا ہے۔ میرے اوپر مدرسہ نہ پہنچ سکنے اور ناغہ ہو جانے کے صدمہ سے بہت اثر تھا۔ اس لئے میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ اور یہاں سے واپسی کیسے ہوگی؟۔

میرے اس اضطراب کو ان کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپتے ہوئے مجھ سے سوال کیا کہ آپ نے مجھے پہچانا؟۔ میرے نفی میں جواب دینے پر انہوں

نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے والد مولانا محمد عبدالحلیم صاحب کا دوست دھوبہا کا رہنے والا فخر الحسن ہوں۔شاید آپ نے ان کی زبان سے میرا نام سنا ہو؟۔ اتنا سنتے ہی میرا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا، اور بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے احتراماً کھڑے ہو کر ان کو بتایا کہ جی ہاں، میں نے والد صاحب سے آپ کا ذکر خیر متعدد مرتبہ سنا ہے۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ مجھے بٹھاتے ہوئے کہا اب تو میرا حق بنتا ہے کہ آپ کو ناشتہ کراؤں اور خود بھی ساتھ میں کرلوں۔ یہ کہہ کر سامنے موجود لوگوں سے ناشتہ لانے کو کہا، اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا، جب آپ نے اپنے والد صاحب سے میرا ذکر سنا ہے تو یہ بھی سنا ہوگا کہ وہ مجھے کیا کہتے ہیں؟ اتنا سنتے ہی مجھے واقعی ہنسی آگئی، اور پھر ان کے اصرار پر مجھے بتانا پڑا کہ والد صاحب آپ کو ''یتیم جلسہ'' کہتے ہیں۔میری زبان سے یہ سن کر وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دیئے۔اور پھر والد صاحب کے عطا کئے نام کی ''وجہ تسمیہ'' بیان کرتے ہوئے کہا، دراصل اب اس علاقہ میں عرصہ دراز سے میں ہی حضرت شیخ الاسلام (حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) کا سب سے معمر شاگرد ہوں۔اس لئے قرب وجوار کے تمام مدارس کے ذمہ داران اپنے یہاں اکابر کو مدعو کرنے کے لئے مجھے ہی استعمال کرتے ہیں۔ جو حضرت شیخ کی نسبت اور میری عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمام تکلیفیں اور سرد مہریاں برداشت کر کے بھی شریک ہونا منظور کر لیتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں میں آپ کے والد اور میرے دیرینہ کرم فرما مولانا عبدالحلیم صاحب بھی ہیں۔جنہوں نے میری

خاطر ایسی تکلیفیں برداشت کی ہیں کہ آپ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے ——اور اب مجھے آپ سے یہ شکوہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس باپ کے بیٹے ہیں جو کمر کمر تک پانی میں ڈوب کر اور سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ کر میلوں کا سفر کرنے کے باوجود خوش رہا کرتے تھے، اور آپ تھوڑی سی تاخیر ہو جانے اور وعدہ خلافی کی وجہ سے ٹرین چھوٹ جانے سے اتنا ناراض ہیں؟

میرا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ان بزرگ سے واقفیت کے بعد ان کی بات کا جواب دوں۔مگر مجبوری یہ تھی کہ وہاں موجود ان کے کئی ایک —— ''خرد'' بھی ان کی بات سن کر زور زور سے ان کی تائید میں اپنی گردنیں ہلا ہلا کر گویا مجھے ہی غلط ثابت کرنا چاہتے تھے؟ اس لئے میں نے کہا حضرت! آپ والد صاحب کے حوالہ سے جس دور کا ذکر کر رہے ہیں اس میں سڑکیں تعمیر ہی نہیں ہوئی تھیں، نہ سواریاں دستیاب تھیں، نہ ہی نہروں و دریاؤں پر آج کی طرح کے پل بنے ہوئے تھے۔اس لئے مجبوراً دستیاب ذرائع وسواریوں ہی کا استعمال کیا جاتا تھا۔مگر آج صورت حال وہ نہیں ہے۔دودھارا سے لے کر بستی تک بہت عمدہ اور پختہ ڈامر کی بنی ہوئی سڑک ہے، اور اسی سڑک سے جیپ کے ذریعہ چند منٹ میں بستی ریلوے اسٹیشن سے آگیا تھا، جب کہ واپسی کے لئے ''حسب دستور قدیم'' تمام راہیں بند ہوگئیں؟ کیا یہ دانستہ، اور اذیت سے دوچار کرنے والی صورت نہیں ہے؟ مجبوری اور اختیاری میں کچھ فرق تو کیجئے۔اور اس طرح کی باتیں کر کے ان دانستہ جھوٹ بولنے والوں اور اذیت سے دوچار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کیجئے۔

میری اس ''مفصل وضاحت'' کے بعد موصوف خاموش ہو گئے۔ پھر ان کے حکم کی تعمیل میں ناشتہ بھی کیا، اور ان سے خوش دلی کے ساتھ دیر تک بات چیت بھی ہوئی۔ اپنے ان بزرگ سے یہی اول و آخر ملاقات ہوئی۔ اب ان شاء اللہ ان سے حشر میں ملیں گے۔

اب آخر میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جیسے تیسے ہم جب دوپہر بعد کی ٹرین سے واپسی کے لئے بستی ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اسٹیشن کے قریب ہی واقع ٹیکسی اسٹینڈ پر وہ نوجوان ڈرائیور مجھے مل گیا جو مجھے لے کر ایک دن پہلے دودھارا گیا تھا۔ چوں کہ جاتے ہوئے اس سے یک گونہ مناسبت ہو گئی تھی، اس لئے وہ مولانا صاحب مولانا صاحب کی صدا لگاتا ہوا لپک کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے اسے دیکھ کر شکوہ آمیز انداز میں کہا، میں تم سے نہیں بولتا ہوں، تم مجھے وہاں چھوڑ کر بھاگ آئے، اور یہ نہیں سوچا کہ مجھے واپس لکھنؤ بھی جانا ہے۔ تکلیف تو مجھے اٹھانا پڑی۔ اگر تمہیں کسی ''بدمعاملگی'' کا سامنا ہوا تو مجھ سے تو بتانا چاہئے تھا؟ جواب میں اس نے یہ ''حیرت انگیز انکشاف'' کیا کہ مولانا صاحب! کوئی بدمعاملگی نہیں ہوئی، مجھے تو بس آپ کو دودھارا پہنچانے ہی کی ذمہ داری دی گئی تھی، جو پوری کر کے میں اپنا کرایہ لے کر واپس آ گیا تھا —— کیا سمجھے آپ؟۔ اللہ کی اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مولانا محمد اسرائیل صاحب بھی تھے۔

یہ دو واقعات یا اپنے ''سفری تجربات'' کو برسبیل تذکرہ بیان کر دیا۔ ورنہ بات چلی ہے تو ایسے اور بھی کئی ''خوبصورت تجربے'' یاد آ رہے ہیں۔ جن

کے ذکر سے قلم روک رہا ہوں۔ کیوں کہ ع

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

کچھ عرصہ تک مجھے سرکاری اصطلاح میں ''دھرم گرو'' کی حیثیت بھی حاصل رہی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب تحریک مدح صحابہؓ کے تعلق سے دیگر قائدین کے ساتھ میں بھی عوامی و سرکاری طور پر بہت سرگرم تھا، اور سرکاری فہرست میں میرا نام بھی ''سنی دھرم گرو'' میں شامل تھا۔ اس کا سلسلہ اگرچہ بہت لمبے عرصہ تک نہیں چلا۔ اور ''کچھ اپنے پیچھے کی صف میں بیٹھنے کے سوچے سمجھے فیصلے'' اور کچھ ''ہم قدم لوگوں'' کے خواہش کے احترام میں میں نے اپنا نام اس ''مقدس فہرست'' سے خارج کرا لینا ہی مناسب سمجھا کہ اگر اللہ کو عزت دینا ہوتا ہے تو کسی ''ظاہری صلاحیت'' کے بغیر بھی وہ نواز دیتا ہے۔ اور اگر اسے عزت دینا منظور نہیں ہوتا تو ''تحفظات'' اور ہاتھ پیر مارنے، اور ''بساط بچھانے'' کی تمام کوششوں کے باوجود ''مطلوبہ مقام'' نہیں مل پاتا۔ کیوں کہ حقیقت یہی ہے کہ ؎

کسی بات کو بگاڑو، کسی بات کو بناؤ
یہ تمہارے بس میں کب ہے، نہ سرِ غرور اٹھاؤ
جسے چاہے دے وہ عزت، جسے چاہے دے وہ ذلت
وتعز من تشاء، وتذل من تشاء

اس فراموش کردہ دور میں یہ ضرور تھا کہ ''سرکار دربار'' سے شناسائی بھی

تھی، اور ''ظاہری عزت'' کے ساتھ وہاں حاضری بھی ہو جایا کرتی تھی۔ پھر اسی ذیل میں اگر ''بڑے بڑے سرکاری اہل کاروں'' کی (جو اگرچہ اپنی ہی غرض سے ہوتی) میرے گھر آمد ہو جاتی، تو پھر پوچھنا ہی کیا، میرے گھر ڈی ایم صاحب، ایس ایس پی صاحب، اپنے لاؤلشکر کے ساتھ آئیں، اور سارے محلہ کو خبر نہ ہو؟ ''اپنی اپنی ضرورت کے مطابق'' اس کی تشہیر بھی کی جاتی۔ اور اچھے خاصے باحیثیت لوگ اس سے مرعوب بھی رہا کرتے تھے۔

میرے پیچھے ہٹ کر ''گوشۂ عافیت'' میں چلے جانے سے ظاہر ہے کہ نہ کوئی فرق پڑنا تھا، نہ پڑا ـــــ آج بھی یہ تمام کام اپنے لوازم کے ساتھ جاری ہیں، مگر اللہ کا کرم ہے کہ اب میں اس کا حصہ نہیں ہوں۔ اور ''اپنی محرومی'' کا مجھے کچھ ملال بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ''غیر ضروری زیر باری'' کے ساتھ تصنع و تکلف سے بچ کر اب میں اپنی صبح و شام کا مالک ہوں، اور جو کچھ بن پاتا ہے مطالعہ اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اپنے ذوق کی تسکین کا سامان کر لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اخلاص کی نعمت عطا کر دے تو اس میں دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کے سنورنے کے بھی اسباب ہیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

البتہ اس ''مختصر دور'' کی کچھ بڑی دل چسپ باتیں کبھی کبھی یاد آتی ہیں جیسے کہ ایک مرتبہ میں لکھنؤ کے ایک بہت تیز طرار اور ''اقتدار وقت کے قریبی'' جوان العمر ڈی-ایم آں جہانی چندر بھانو صاحب کے سرکاری بنگلہ میں موجود تھا۔ تفصیل یاد نہیں، مگر کوئی اہم موقع تھا۔ اور ایس-ایس-پی صاحب و دیگر کئی پولیس و انتظامیہ کے اعلیٰ افسران بھی موجود تھے۔ میٹنگ کی

ضروری کارروائی کے بعد جب ہم چند لوگ غیر رسمی طور پر گفتگو کر رہے تھے تو دوران گفتگو آج کل کے کم عمر بچوں کی سرگرمیوں اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کی بات آنے پر ایس-ایس-پی صاحب کی موجودگی میں ڈی-ایم صاحب نے اپنے ۵ رسالہ بچے کے سلسلہ میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''مولانا صاحب! میرا لڑکا ابھی پورے پانچ برس کا بھی نہیں ہے، مگر اس کی اڑان دیکھئے کہ ایک دن کپتان صاحب (ایس-ایس-پی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور میں دونوں بیٹھے تھے کہ اندر سے یہ بھی آ گیا۔ اور مجھ سے ایک عجیب سوال کیا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ اس نے پوچھا کہ پاپا، آپ دونوں میں بڑا افسر کون ہے؟ میں نے اسے ٹالتے ہوئے جواب دیا کہ بیٹا، ہم دونوں اپنی اپنی جگہ بڑے افسر ہیں، مگر وہ اپنے اس سوال پر بضد ہو گیا کہ دونوں میں بڑا کون ہے؟ تب کپتان صاحب نے اس سے کہا، بیٹا! آپ کے پاپا تو ہم سب سے بڑے افسر ہیں۔ یہ تو پورے ضلع کے سب سے بڑے افسر ہیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اب سنئے! ایک دن میں موبائل پر ہوم سکریٹری صاحب سے بات کر رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ہمارے افسر ہیں، اس لئے ان سے میں سر، سر، کر کے بات کر رہا تھا۔ اور میرا بیٹا غور سے سن رہا تھا۔ جب ہماری بات چیت ختم ہو گئی، تو میرے بیٹے نے

مجھ سے حیرت کے ساتھ سوال کیا کہ پاپا! یہ کون صاحب تھے، جن سے آپ سر، سر، کر کے بات کر رہے تھے؟ کپتان صاحب تو کہہ رہے تھے کہ آپ سب سے بڑے افسر ہیں؟ اب آپ بتایئے کہ میں اسے کیا جواب دیتا؟ یہ ہے کہ آج کل کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا حال، کہ اس نے نہ جانے کتنے دن پہلے کی بات یاد رکھی۔ اور پھر اس کے حوالہ سے مجھ سے سوال کر کے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔"

ہمارے یہ آں جہانی ڈی-ایم صاحب آسام الیکشن ڈیوٹی پر بھیجے گئے تھے۔ وہیں ہارٹ فیل ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ مجموعی طور پر بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ کبھی کبھی ان کی یاد آجاتی ہے تو ان کی "جواں مرگی" پر قلق ہوتا ہے۔ اسی طرح "اسی دور" کے ایک اے-ڈی-ایم (سٹی) جے-پی سنگھ بھی اپنی شرافت، ملنساری اور نرم خوئی کی وجہ سے برابر یاد آتے ہیں۔ میں نے اتنا اعلیٰ اور ذمہ دار منصب پر فائز افسر جے-پی سنگھ صاحب جیسا نہیں دیکھا۔ اتنے سادگی پسند اور شیریں زباں کہ کہیں سے افسری کی خوبو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ برابر (بغیر کسی منصبی ضرورت کے) ملاقات کے لئے گھر آجاتے تھے۔ ان کو بھی مجھ سے کچھ ایسی مناسبت ہوگئی تھی کہ میری باتوں میں ان کو مزہ آتا تھا۔ اور مجھے بھی ان سے مل کر بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ برابر اصرار کے ساتھ مجھ سے کہتے کہ مولانا صاحب! آپ کوئی کام مجھ سے لیتے ہی نہیں، آپ جانتے ہیں کہ سرکاری طور پر میرے اتنے اختیارات ہیں کہ میں

آپ کے کسی کام آجاؤں تو مجھے خوشی ہوگی۔ مگر میں ہنس کر ان کو یہی جواب دے دیتا کہ مجھے بس آپ اچھے لگتے ہیں۔ جب کوئی ضرورت ہوگی تو بتاؤں گا۔ اتفاق سے پھر جب ان کا تبادلہ "جوائنٹ الیکشن کمشنر" کے منصب پر ہوگیا، تو مجھے یاد آیا کہ میری "الیکشن آئی ڈی" بہت پرانی ہے، جس میں فوٹو اتنا پرانا ہے جو میری موجودہ شکل وشباہت سے میل نہیں کھاتا۔ میں نے اس کا ذکر ان سے کیا تو انہوں نے فوراً ہی نئے فوٹو کے ساتھ میری پرانی آئی-ڈی لے لی اور دو چار دن میں نیا فوٹو لگوا کر نئی آئی-ڈی مجھے بھجوا دی۔ مگر ہوا یہ کہ اب نام و پتہ میں کئی اسپیلنگ کی غلطیاں در آئیں۔ میں نے پھر ان سے یہ بات کہی تو دوبارہ انہوں نے ان کی درستگی کے لئے آئی-ڈی منگوالی۔ لیکن "ظالم اہل کاروں" کا ستم دیکھئے میرے صاف صاف ساری تفصیلات لکھ کر دے دینے کے باوجود، ان کی "حسن توجہ" سے کچھ اور نئی قسم کی غلطیاں پیدا ہوگئیں۔ پھر مجھے انہیں اس کی اطلاع دیتے ہوئے شرم آئی۔ اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک ملاقات کے موقع پر انہوں نے ہی دریافت کیا تو مجھے جھجکتے جھجکتے انہیں صورت حال سے باخبر کرنا پڑا۔ میری روداد سن کر وہ شریف انسان ایسا جھینپے جیسے انہوں نے خود میرے اوپر کوئی ظلم کر دیا ہو۔ پھر "سسٹم" پر کچھ تبصرہ کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے باصرار کہا کہ اب آپ کسی اپنے معتمد و جان کار آدمی کو میرے آفس میں بھیج دیجئے۔ میں خود اپنی نگرانی میں آپ کا یہ کام کراؤں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے خاص معتمد اور مدرسہ کے استاذ مولانا محمد شفیع صاحب کے ذمہ یہ کام کیا، جو

پوری طرح درست آئی-ڈی بنوا کر اپنے ساتھ لے آئے۔قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مولانا محمد شفیع صاحب کے بیان کے مطابق اتنے بڑے منصب پر فائز ہوتے ہوئے جے-پی سنگھ صاحب خود کمپیوٹر آپریٹر کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھے اور اپنی نگرانی میں کام کروایا۔

اب کہاں ایسی وضع داریوں کو نباہنے والے لوگ! توقع یہی ہے کہ اب جے-پی سنگھ صاحب اپنی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہوں گے۔عرصہ دراز سے ان کی کوئی خیر خیریت کا بھی علم نہیں ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو ان کی نیکیوں کا اپنے انصاف کے مطابق صلہ عطا فرمائے۔اسی دور سے وابستہ ایک ''تلخ یاد'' بھی قابل ذکر ہے۔وہ یہ ہے کہ ہمارے لکھنؤ میں ایک عجیب وغریب اور ''چیستانی'' ڈی-ایم صاحب تبادلہ ہو کر آئے۔چوں کہ وہ اپنے سے پہلے اسی منصب پر فائز ڈی-ایم صاحبان کے برعکس انتہائی کھرّے اور بد اخلاقی کی حد تک خاموش رہ کر سو بلاؤں کو ٹالنے والے تھے، اس لئے طبعی طور پر مجھے ان سے بڑی وحشت تھی۔حسب روایت، نیا چارج لینے پر ہمارا اور ان کا اپنے اپنے گھروں میں ''چائے کی میز پر'' تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا، اور جیسا کہ مجھے یاد آتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس منصب پر رہتے ہوئے میرے غریب خانہ کا بھی رخ نہیں کیا۔البتہ ہمیں اپنی ''ملّی ضرورت'' کے تحت چند مرتبہ دیگر لوگوں کے ساتھ ان کے ''در دولت'' پر ضرور حاضری دینا پڑی۔(مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ان کے دماغ میں وہ ''کیڑا'' بھی کسی نہ کسی شکل میں تھا، جو کسی اعلیٰ افسر میں ہونے سے انصاف کی راہ میں

یقینی طور پر رکاوٹ ہوتی ہے)۔بہر حال ان ہی کے ''مبارک دور'' میں ایک بہت بھیانک و ناخوشگوار ''تصادم کی شکل کا'' حادثہ بھی پیش آیا، اور ایک مسلمان کی اس میں شہادت بھی ہوگئی۔جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت اضطراب واشتعال تھا۔ہم ڈی-ایم اور ایس-ایس-پی صاحبان سے مل کر مسئلہ کا مناسب حل نکالنا چاہتے تھے۔اور ہمارے ضلع کے یہ دونوں اعلیٰ افسران ہماری دسترس سے باہر تھے(تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔اس لئے صرف اشاروں پر اکتفا کیا جا رہا ہے) تلاش بسیار کے بعد یہ دونوں حضرات ایک ایسی جگہ ملے جہاں ایسے ''ہنگامی حالات'' میں انہیں نہ رہ کر عوام کے درمیان ہونا چاہئے تھا؟ مگر اللہ ہی بہتر جانے اتنے ذمہ دار افسران کے اس غیر ذمہ دارانہ رویہ کی مصلحت کیا تھی؟ ہماری بے بسی، اور ہمارے عوام کے غم وغصے پر ہمارے خالق ومالک کو رحم آیا، اور ہمیں اپنی بات کہنے کا موقع ملا تو میں نے جذبات کی رو میں بہ کر لکھنؤ کمشنری کے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں ڈی-ایم صاحب کے تعلق سے ایسی سخت باتیں ان کے روبرو کہہ دیں جو نہ ان کے شایان شان تھیں نہ میرے لئے مناسب تھیں۔ڈی-ایم صاحب تو ''حسب سابق'' اس موقع پر بھی خاموش ہی رہے، لیکن بعد میں مجھے خود بھی اس کا احساس ہوا، اور میرے ساتھیوں نے بھی اس طرف متوجہ کیا، بلکہ دھمکایا کہ ''کچھ بھی'' ہو سکتا ہے — مگر ''جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے''۔

میری زندگی کا یہ ایک ناخوشگوار اور ناقابل فراموش واقعہ ہے۔جسے

ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر ''شیر کے منھ سے سلامتی کے ساتھ نکال لینے'' کے اپنے مالک کے اس احسان کا شکر گذار کیوں کر نہ ہوں؟ مجھے اپنے ''چوک سرکل'' کے مختلف اوقات میں رہنے والے دو اعلیٰ پولیس افسران (اس وقت کی اصطلاح کے مطابق سی-او) بھی اپنے حسن سلوک کی بنا پر یاد رہیں گے۔ ان میں سے ایک اپادھیائے جی مجھے اپنا بڑا بھائی کہہ کر مجھے وہی عزت واکرام بھی دیا کرتے تھے۔ (معلوم نہیں کہ وہ اب کہاں ہیں؟ اور برسرکار ہیں یا ملازمت سے سبکدوش ہو چکے؟) دوسرے سنہا جی جو نسبتاً کم عمر ہونے کی بنا پر مجھے ''اپنے پتا کے سمان'' کہتے، اور واقعی میرے ساتھ بہت محبت آمیز سلوک کرتے تھے (یہ ابھی ملازمت میں ہیں۔ اور اب ترقی پا کر ''پرانی اصطلاح کے مطابق'' ایس-پی-سٹی کے منصب پر فائز ہیں) ابھی چند ماہ قبل وہ اپنے کئی ماتحت افسران کے ساتھ میرے سب سے چھوٹے بھائی عبدالوحید کے یہاں آئے تو خاص اہتمام کے ساتھ مجھ سے بھی اپنے اسی دیرینہ منکسرانہ انداز میں ملے، اور ماتحت افسران سے ''اپنے خصوصی رشتہ کے ساتھ'' میرا تعارف بھی کرایا)۔

سچی بات یہ ہے کہ اپنے اندر میں کوئی ایسی خوبی نہیں پاتا کہ اللہ کے لائق احترام بندے مجھے اس طرح اپنی بے لوث محبتوں سے نوازیں — مگر وہی کہ ''پیا جس کو چاہے، سہاگن وہی ہے''۔

اعزاز رضوی یاد آ گئے: آں جہانی کلیان سنگھ کے دور حکومت میں ان کے ایک کابینی وزیر اعزاز رضوی صاحب مرحوم بھی تھے۔

بی-جے-پی سے وابستہ ہونے کے علاوہ ان میں اور کوئی ایسی بات نہ تھی کہ لوگ بے ساختہ ان سے محبت نہ کرنے لگ جائیں۔ صاحب نسب بھی اور صاحب نسبت بھی۔ بلند قامت بھی اور بلند اخلاق بھی۔ گلے گلے تک سیاسی ہوتے ہوئے بھی غیر سیاسی حرکتوں کے نہ صرف عادی بلکہ ان سے لطف اندوز ہونے والے۔ دوسروں سے کام لینے کے بجائے دوسروں کے کام آنے سے خوش ہونے والے۔ سندیلہ ضلع ہردوئی کے ایک خانوادۂ سادات کے فرد تو تھے ہی، مولانا قاری سید ودود الحئی ندویؒ کے دامادی نے ''دو آتشہ'' بنا کر دینی حلقوں کے بھی قریب کر دیا۔ صرف دامادی کی پہچان ہوتی تو بس تعارف کی حد تک کام آتی۔ مگر ''اپنی سیاسی مصلحتوں سے'' گیروا چولا پہننے کے باوجود وہ تو اندر سے واقعی ایک دردمند اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کی اسی ''اندرونی مجبوری'' نے انہیں تواضع وانکساری اختیار کرنے پر اس طرح آمادہ کر رکھا تھا کہ اتر پردیش جیسے ملک کے سب سے بڑے صوبہ میں کلیان سنگھ کے دور حکومت میں واحد مسلم کابینی وزیر ہوتے ہوئے راہ چلتے کوئی پرانا ''غیر سیاسی شناسا'' مل جاتا تو اسے نظر انداز نہیں کر پاتے تھے، اور پھر اس کی دوکان پر، یا سڑک ہی پر اسے یہ باور کرانے کے لئے کہ ''میں تمہیں بھولا نہیں ہوں'' اپنے کارواں کو رکوا دیتے۔ پھر بسا اوقات جب سڑک پر ''جام'' لگ جاتا تو راہ گیروں و تماش بینوں کو پتہ چلتا کہ ایک کابینی وزیر کے ''پروٹوکال'' توڑ دینے کی وجہ سے یہ جام لگا تھا۔ علم دوست، ادب دوست، اور دین دوست ہونے کی وجہ سے ہر حلقہ میں شناسائی بھی، اور ہر

ایک کو اس کا ''واجب احترام' دینے میں پیش پیش بھی۔

زمانہ طالب علمی میں میرے رہائشی محلہ پاٹانالہ میں طلبہ کے ایک رہائشی ہاسٹل بنام Happy Lodge میں سکونت کی وجہ سے میرے والد ماجد و دیگر خاندانی بڑوں سے ''عقیدت مندانہ رشتہ'' بھی رہا اور ہمارے گھروں میں کبھی کبھی آمد و رفت بھی رہی۔ پھر ہمارے شہر کے مشہور خوش الحان، خوش اخلاق، اور مقبول امام خطیب و عالم حضرت مولانا قاری سید ودود الحئی ندویؒ صاحب کی دامادی نے قربتوں کو رشتوں کے مساوی کر دیا۔ وہ والد ماجدؒ سے تو انتہائی خندہ پیشانی اور احترام کے ساتھ پیش آتے ہی، مجھ سے بھی اپنے خسر قاری صاحب، اور اس سے بڑھ کر دین اور دینی تعلیم کی نسبت کے احترام میں اس طرح پیش آتے جیسے میں ان کا کوئی بڑا ہوں؟ اپنے ''دور وکالت'' سے لے کر ''دور وزارت'' تک انہوں نے ہمیشہ میرا استقبال کرسی چھوڑتے ہوئے کھڑے ہو کر کیا — حالاں کہ میرا ان سے تعارف ہی بڑے چھوٹے کے اس فرق کے ساتھ ہوا کہ قاری صاحب مرحوم کی صاحبزادی آصفہ باجی (ڈاکٹر آصفہ زمانی) کے شوہر ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں ہمیشہ اعزاز بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ مگر انہوں نے کبھی بھی میرا نام لے کر مجھے مخاطب نہیں کیا، بلکہ ''مولانا'' کہہ کر ہی میری طرف متوجہ ہوئے۔ جب کہ ان کو قاری صاحب اور ان کے گھر گھرانے سے ہماری قربتوں کا بہ خوبی علم بھی تھا، اور اس کی رعایت بھی کرتے تھے۔

میں کسی کو خوش کرنے اور کسی کی رعایت میں نہیں، بلکہ اپنے تجربوں کی

بنیاد پر اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہوں کہ اعزاز بھائی واقعی ایک بہت ہی شریف، با اخلاق، اور با مروت انسان تھے۔ کاش کہ ان پر ''سیاست کا جنون'' نہ سوار ہوتا، اور وہ بی۔جے۔پی میں شامل ہو کر، اور اس پارٹی کے وزیر بن کر ''اپنی اصلی شخصیت'' کو داغ دار نہ کرتے؟ مجھے یقین ہے کہ میری ''اس تمنا'' کو میری احمقانہ سوچ قرار دے کر بہت سے لوگ (جس میں ان کے افراد خانہ بھی شامل ہوں گے) اسے رد کر دیں گے۔ اور اپنے موقف کے ثبوت میں ان کی ''ان حصول یابیوں'' کے حوالے دیں گے، جن سے انہوں نے خود تو کم، ان کے ''پسماندگان'' نے زیادہ منافع حاصل کئے؟۔

میں اپنے مزاج و عادت کے خلاف اعزاز بھائی کے انتقال کی خبر پا کر ان کی سرکاری رہائش گاہ پر تعزیت کے لئے ''اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر'' گیا — مگر وہاں تعزیت کس سے کرتا؟ وہاں تو یہ ''تکلیف دہ منظر'' تھا کہ برسر اقتدار جماعت کے اہم فرد، اور کابینی وزیر کے انتقال پر ان کے پسماندگان سے ''اظہار ہمدردی'' کرنے کے لئے ان کی پارٹی کے ''بڑے بڑے نیتا'' موجود تھے۔ اور ایک کاغذ (یا درخواست) پر ان میں سے اہم اہم لوگوں کے سفارشی دستخط لئے جا رہے تھے، جس پر درج تحریر کے مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ اعزاز رضوی کی پارٹی کے ساتھ وفادارانہ وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے اچانک انتقال کی وجہ سے خالی ہونے والی جگہ پر ان کی بیٹی شیما رضوی کا تقرر کیا جائے، اور خود شیما رضوی اس طرح بے تحاشا اور بلند آواز میں گریہ و ماتم کر رہی تھیں کہ بے ساختہ ان کی طرف لوگوں کی نگاہیں

اٹھ رہی تھیں۔ جب کہ ابھی اعزاز رضوی صاحب کا جنازہ رکھا ہوا تھا، جس کو قبرستان کی طرف لے جائے جانے کے لئے ”کچھ اور بھی اہم ترین شخصیتوں“ کی آمد اور ان کی لاش پر پھول مالائیں چڑھائے جانے کا انتظار ہو رہا تھا؟۔

میں اس ”کرب ناک منظر“ کی تاب نہ لاکر دنیا کی خود غرضی و مفاد پرستی کو کوستا، اور زیر لب یہ بدبداتا ہوا اسی جگہ سے واپس آگیا تھا کہ ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے، تماشا نہیں ہے

پھر اس کے بعد کیا کیا ہوا؟ اور اعزاز رضوی کے پسماندگان و وابستگان نے ان کے نام اور نسبت سے کیا کیا مراعات حاصل کیں؟ نہ اس سے مجھے کوئی غرض ہے، نہ ہی یہ میرا موضوع گفتگو ہے۔ البتہ اپنا معاملہ یہ ہے کہ جب کبھی ان کی یاد آجاتی ہے تو اپنے رحیم وکریم پروردگار سے یہ دعا کر لیتا ہوں کہ وہ مرحوم اعزاز رضوی کے سلسلہ میں ”میرے حسن ظن“ کی لاج رکھ کر ان کی مغفرت کاملہ فرمائے۔ کیوں کہ یہ تو دیکھنے والوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ اللہ کا جو بندہ بھی ان کے پاس فریادی بن کر گیا، انہوں نے اس کی دل جوئی کی کوشش تو ضرور کی اور اللہ کے سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

مناسب ہوگا کہ اسی موقع پر اعزاز رضوی مرحوم کے اپنے ساتھ حسن سلوک کا ایک واقعہ تو سنا ہی دوں؟

بات اس وقت کی ہے جب وہ صرف ایک وکیل اور میرے لئے اعزاز بھائی تھے۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلہ پر مسلم بچیوں کا ایک نیک نام اور قابل اعتماد تعلیمی ادارہ تھا، جہاں پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ بارہویں درجات (انٹرمیڈیٹ) تک تعلیم ہوتی تھی۔ بیشتر طالبات و معلمات پابند پردہ بھی تھیں اور مجموعی طور پر کالج کی فضا میں دین داری بھی تھی۔ ان خصوصیات کا حامل اس وقت ہمارے شہر میں اس سے آگے تک تعلیم کا ایک اور بھی کالج تھا، مگر وہ ہمارے گھر اور محلہ، بلکہ کہنا چاہئے پرانے لکھنؤ کی کثیر مسلم آبادی والے ہمارے علاقہ سے اچھے خاصے فاصلہ پر تھا—— اس لئے ہمارے خاندان و دیگر مسلم گھرانوں کی مذہبی اقدار سے وابستہ لڑکیاں اسی کالج میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ کالج میں ایک نئی پرنسپل کا ان ہی دنوں تقرر ہوا تھا، جو ”کچھ زیادہ ہی روشن خیال“ اور کالج کو اپنے حساب سے ترقی دینے کی خواہش مند تھیں۔ میری ایک بھانجی نے جو کالج کے مقررہ ضوابط کے مطابق داخلہ کی اہلیت رکھتی تھی، کالج میں داخلہ حاصل کرنا چاہا تو نہ جانے کیوں پرنسپل صاحبہ نے اس کا داخلہ لینے سے انکار کر دیا؟ اپنے طور پر اس نے اور اس کے گھر والوں نے تمام کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس کا مجھ سے ذکر کیا، تو میں اس سلسلہ میں سفارش کے لئے اعزاز بھائی سے ملا، جو اس کالج کے اسسٹنٹ منیجر تھے اور منیجر صاحب کے غیر ملکی سفر پر

ہونے کی وجہ سے مینیجنگ کمیٹی کی طرف سے وہی ذمہ دار تھے۔ میں نے اعزاز بھائی کے سامنے فارم و دیگر ملحقات رکھ کر ان سے کالج میں داخلہ کے لئے کہا تو انہوں نے بہت مثبت انداز میں یقین دہانی کراتے ہوئے پرنسپل صاحبہ کے نام اپنا ایک سفارشی خط میرے حوالہ سے لکھ کر دیتے ہوئے کہا کہ بچی یہ خط لے کر جائے گی تو اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ اعزاز بھائی کا یہ خط لے کر بچی کالج گئی تو خط دیکھتے ہی پرنسپل صاحبہ بجائے نرم پڑنے کے اور بھی برافروختہ ہو گئیں، اور انہوں نے بڑے تمکنت آمیز انداز میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اس سے کہا کہ پریشر بنا رہی ہو؟ میں نہیں جانتی مولانا...... وغیرہ کو۔ پرنسپل میں ہوں، میں نے کہہ دیا کہ داخلہ نہیں ہوگا۔ تو اب نہیں ہوگا۔ چاہے جتنا بھی زور لگا لو۔

مجھے پرنسپل صاحبہ کے اس رویہ سے واقعی شدید صدمہ ہوا۔ اور میں پیچ وتاب کھاتا ہوا دوبارہ اعزاز بھائی کے پاس پہنچ گیا۔ صبح کا وقت تھا اور وہ کچہری جانے سے پہلے حسب معمول اپنے چیمبر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کی کرسیوں پر ان کے کچھ مؤکل صاحبان بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے صبح صبح تمتماتے ہوئے چہرہ کے ساتھ آتا دیکھ کر حسب معمول انہوں نے میرا کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہوئے پوچھا، خیریت تو ہے، صبح صبح کیسے آنا ہوا؟ میں نے جوں ہی ان کے سامنے پرنسپل صاحبہ کا فیصلہ اور ان کے ''ارشادات عالیہ'' کا ذکر کیا، وہ جیسے تلملا اٹھے، اپنے مؤکلوں کو وہیں چھوڑ چھاڑ کے باہر نکلے اور اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے مجھے اشارہ

کر کے پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور بلا تاخیر کالج کے آفس پہنچ کر پرنسپل صاحبہ کو وہیں طلب کر کے ان پر برس پڑے، اور ان سے سیدھے سوال کر لیا کہ آپ کو پرنسپل رہنا ہے یا نہیں؟ آپ کا جب ابھی سے یہ حال ہے کہ نہ منیجر کو خاطر میں لانے کو تیار ہیں، نہ ہی ایسی (میری طرف اشارہ کر کے) معزز شخصیتوں کا احترام کرنا جانتی ہیں۔ تو آپ آگے کیا گل کھلائیں گی؟ اچھا ہوا کہ آپ نے اپنی حرکتوں سے بتا دیا کہ آپ اس کالج کی پرنسپل بننے کی اہل نہیں ہیں؟ مولانا کی بھانجی تو اسی کالج میں پڑھے گی، چاہے ہمیں آپ کو معطل کرنا پڑ جائے۔ اپنے ماتحت اہل کاروں کی موجودگی میں اتنی کھری کھوٹی سن کر پرنسپل صاحبہ کے نہ صرف ساتوں طبق روشن ہو گئے، بلکہ اپنی خفت وشرمندگی کے احساس سے ان کا چہرہ جھک گیا، آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ اور زیر لب بدبداتے ہوئے اپنی نامناسب حرکت پر معذرت کرتے ہوئے معافی طلب کرنے لگیں۔ اعزاز بھائی کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اسی جھونک میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پرنسپل صاحبہ سے پوچھا، آپ ان کو جانتی ہیں؟ اور ان کے نفی میں سر ہلانے پر ایک مرتبہ پھر ان کا پارہ چڑھ گیا، اور اچھے خاصے کرخت لہجہ میں ان سے کہا، ہاں آپ تو بس اتنا جانتی ہیں کہ آپ کالج کی پرنسپل ہیں۔ اور اس شہر میں آپ کے علاوہ کوئی عزت دار نہیں رہتا ہے۔

میں نے جب ان سے واپسی کا اشارہ کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے واپسی کے لئے مڑے کہ، آج اس لڑکی کے داخلہ کی پوری کارروائی ہو جانا چاہئے۔

اور یہ یاد رکھئے گا کہ اگر آپ کو اپنی عزت وعہدہ پیارا ہو تو کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہ ہونا چاہئے۔

واپسی میں جب اعزاز بھائی مجھے میرے گھر چھوڑنے کے لئے آرہے تھے تو راستہ میں میں نے ان سے کہا کہ اعزاز بھائی کچھ زیادہ ہو گیا، اور اپنے عام مزاج کے خلاف آج آپ کو کچھ زیادہ ہی غصہ آگیا؟

جواب میں انہوں نے کہا، مولانا مجھے اپنی پرواہ نہیں تھی، مجھے غصہ تو اس وجہ سے تھا کہ اس نے ''آپ کے مقام'' کو نہ سمجھ کر آپ کو تکلیف پہنچائی اور مجھے صدمہ سے دوچار کیا۔

اور اب ایک سنا ہوا واقعہ ان کے دور وزارت کا بھی اس لئے نقل کر رہا ہوں کہ ہمارے قارئین کو ان کا ''اندرون'' سمجھنے میں مدد مل سکے؟

کلیان سنگھ کابینہ میں ان کے پاس غذا اور رسد کا قلم دان تھا۔ ایک اقامتی مدرسہ کے طلبہ کے لئے پچھلی حکومت کے دور میں شکر اور مٹی کے تیل کا رعایتی سرکاری نرخ میں دستیاب کرنے کا حسب ضابطہ کوٹہ تھا۔ جو اس قسم کے اقامتی تعلیمی اداروں کے لئے جاری کئے جانے کا ضابطہ ہے۔

کلیان سنگھ کی بی۔جے۔پی سرکاری آئی تو نیچے کے اہل کاروں نے ''اپنے آقاؤں کی خوشنودی'' کے لئے وہ کوٹا منسوخ کر دیا۔ اس کی اطلاع کسی ذریعہ سے اعزاز رضوی صاحب کو ہوئی تو انہوں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے از خود رابطہ قائم کر کے تفصیلات حاصل کیں، اور وہ کوٹا نہ صرف بحال کیا، بلکہ متعلقہ اہل کاروں کی سرزنش کرتے ہوئے ان سے کہا کہ یہ

ہماری سرکار کے ساتھ آپ کی ''کوئی ہمدردی'' نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں بدنام کرنے کی ایک سازش ہے۔ اور ایسی کسی حرکت کو ہم آئندہ برداشت نہیں کریں گے۔

یہ تو ہوئی اعزاز رضوی مرحوم کے کردار کی بات، کہ مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے کسی مطالبہ کے بغیر انہوں نے اس معاملہ میں مداخلت کر کے وہ کیا جو ان سے ان کے ضمیر اور ''دینی غیرت'' نے کرایا —— دوسری طرف ان کا یہ ملال بھی قابل ذکر ہے کہ اتنا اہم کام کسی مشقت و مطالبہ کے بغیر جس ''دردمند شخص'' کے ذریعہ انجام پایا، ذمہ داران مدرسہ نے اس کا ''رسمی شکریہ'' ادا کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟۔

دراصل اعزاز رضوی مرحوم کا ذکر میں نے اپنی ذات سے وابستہ ایک واقعہ کو بیان کرنے کے لئے شروع کیا تھا —— مگر ہوا یہ کہ ع

آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی

جس واقعہ کو ذکر کرنے کے لئے تمہیدی طور پر چند ناقابل فراموش حوالوں سے اعزاز رضوی مرحوم کا ذکر کیا، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ایک دن فون پر انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ میں نئی ریاستی حج کمیٹی کی تشکیل کرنا چاہتا ہوں، اس میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں نے کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے آپ کا نام تو خود ہی رکھ دیا ہے۔ اب کچھ اور اچھے، سمجھدار و لائق اعتماد علماء وغیر علماء کے نام مجھے سوچ سمجھ کر بتایئے، تا کہ ان میں سے کچھ اور ممبروں کا بھی انتخاب ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی کمیٹی بنے جو واقعی

حجاج کرام کے مفاد میں کچھ کام کر سکے۔

میں نے اپنے نام کی شمولیت پر جوں ہی کچھ اعتراض ومعذرت کرنا چاہی، انہوں نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ ''مولانا یہ تو دینی معاملہ ہے، کیا بی-جے-پی کے دور حکومت میں آپ مسجد کی امامت اور نماز پڑھنے سے بھی انکار کر دیں گے؟۔ بہ ہر حال میں نے ان کی فرمائش پر چند نام دیئے اور میرے ساتھ ہی ان میں سے بھی دو حضرات کو انہوں نے صوبائی حج کمیٹی کا ممبر بنایا، جب کہ وہ خود اس کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

غالباً میرے اس پیش کش کو قبول کر لینے سے انہیں کچھ ''غلط فہمی'' ہوئی، اور انہوں نے اقلیتوں سے متعلق کسی ادارہ کا (مجھے اب اس کی تفصیل یاد نہیں رہ گئی کہ اقلیتی کمیشن تھا، مدرسہ بورڈ تھا، یا کوئی اور ادارہ) چیرمین بننے کے لئے بہت ہی شد ومد اور اصرار کے ساتھ بار بار کہنا شروع کر دیا اور میں ہر بار ''اپنے مزاج کے مطابق'' انکار کرتا رہا۔ میں نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میرے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ حکومت بی-جے-پی کی ہے۔ بلکہ میں ''اپنے سوچے سمجھے فیصلہ'' کے مطابق آج تک کسی خالص مسلم تنظیم سے بھی باضابطہ طور پر پیش کش اور اصرار کے باوجود وابستہ نہیں ہوا۔ نہ میں ''جمعیۃ علماء'' سے باضابطہ طور پر جڑا۔ نہ ''ملّی کونسل'' سے، نہ ''ملّی جمعیۃ علماء''، اور نہ ''مرکزی جمعیۃ علماء'' اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' سے —— جب کہ یہ سب خالص مسلمانوں کی اور غیر سرکاری تنظیمیں ہیں۔ پھر بھلا کسی سرکاری ادارہ میں ''سرکاری احسان'' کے ساتھ شمولیت کی کیا

گنجائش ہے؟

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا کہ اعزاز بھائی کو ذاتی طور پر مجھ سے اللہ واسطے کی محبت تھی۔ اور یہ اسی محبت کا ''شاخسانہ'' تھا کہ وہ اپنی ''پاپابیوں'' میں مجھے بھی کسی نہ کسی درجہ میں شریک کرنا چاہتے تھے؟ مگر اپنی ''پست ہمتی یا بے صلاحیتی'' کی وجہ سے جس طرح اس سے پہلے اور اس کے بعد میں نے ''آگے آنے'' کے کئی مواقع ضائع کئے۔ اسی طرح اس پیش کش کی طرف بھی میرا کوئی التفات نہیں ہوا؟۔

اتفاق یہ کہ اعزاز رضوی صاحب کے سرکاری وزارتی عملہ میں بہ حیثیت پی-اے ہماری کاکوری کے ایک نوجوان معین صدیقی بھی شامل تھے۔ جن کی رہائش ہمارے مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ سے متصل ہی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی عبدالولی سے دوستانہ رشتہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھے اپنا بڑا مانتے ہوئے بھائی صاحب ہی سے مخاطب کرتے تھے۔ (سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی چندماہ قبل ہی ان کی وفات ہوگئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) معین صدیقی بہت تیز طرار اور اپنے منتری جی کے بہت منہ لگے، ہنس مکھ وملنسار آدمی تھے۔ ان کے منتری جی جب خود مجھے شیشے میں نہ اتار سکے، تو یہ کام انہوں نے اس چیلنج کے ساتھ معین کے سپرد کیا کہ ''میں جب تمہاری صلاحیت کو مانوں گا کہ تم مولانا کو چیئرمین بننے پر آمادہ کرلو''۔ بس پھر کیا تھا، معین اسی مہم پر لگ گئے۔ کئی دنوں تک ایسا ہوا کہ میرے مدرسہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ پہنچ جاتے۔ انہوں نے اپنی باتوں کا ''ہر

جال'' مجھ پر ڈالا۔ اپنے رشتہ وقربت کے حوالے دے کر بھی انہوں نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر انہیں کامیابی نہ مل سکی۔ بالآخر ایک دن مایوس ہو کر انہوں نے مجھ سے کہا: خیر یہ تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کسی بھی صورت میں چیرمین بننا گوارہ نہیں کریں گے ـــــ مگر مجھے بس ایک بات کا جواب دے دیجئے کہ آخر اس عہدہ کو قبول کرنے میں آپ کے لئے رکاوٹ کیا ہے؟ یہ کوئی بی۔ جے۔ پی کا عہدہ تو ہے نہیں، یہ تو ایک اعزازی سرکاری عہدہ ہے۔ جس میں آپ کو ڈرائیور کے ساتھ کار اور لال بتی ملے گی۔ یہ تو ایسا عہدہ ہے جسے حاصل کرنے کے لئے لوگ بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے ہیں، سورس لگاتے ہیں، اور لائن لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ کے لئے تو یہ فخر کی بات ہے کہ آپ نے خود طلب نہیں کیا، بلکہ عہدہ خود چل کر آپ کے پاس آیا ہے۔ منتری جی کے دل میں آپ کی اتنی عزت ہے کہ جب وہ خود آپ کو راضی نہ کر سکے تو مجھے اس کام پر لگایا۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ میرا آپ سے کیا رشتہ ہے۔ کیا آپ اپنے چھوٹے بھائی کو سرخ رو نہیں کرنا چاہتے؟ یہ تو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے اس عہدہ کو قبول کر لینے سے منتری جی کی نظروں میں میری کتنی اہمیت بڑھ جائے گی؟۔

میں نے کہا، معین صاحب! بات صرف اتنی ہے کہ ''دیوانہ سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنا ہے''۔ یہ تو آپ نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ کے منتری جی مجھے دیکھ کر اپنی کرسی پر بیٹھے نہیں رہتے، وہ کھڑے ہو کر میرا استقبال کرتے ہیں، چاہے ان کے اردگرد کتنے ہی بڑے بڑے لوگ اور اعلیٰ

افسران بیٹھے ہوں ـــــ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ میرا حق ہے اور میں اتنا بڑا آدمی ہوں۔ بلکہ سچائی یہ ہے کہ یہ میرے خدا کا میرے اوپر خصوصی کرم ہے کہ اس نے منتری جی کے دل میں میری اتنی عزت ڈال دی ہے۔ نہ میرا ان پر کوئی ایسا احسان ہے، جس کا وہ حق ادا کرتے ہوں، نہ میرے اندر کوئی ایسا کمال ہے، جس سے وہ مرعوب ہوں۔ بلکہ یہ ان کی شرافت کی بات ہے کہ وہ اتنا بڑا عہدہ ومنصب پانے کے باوجود ''پرانے رشتوں'' کو نہیں بھولے ہیں ـــــ اب میں نہیں چاہتا کہ چند دنوں کے لئے ''ہٹو بچو'' کی خاطر اپنے اس اعزاز واکرام سے محروم ہو جاؤں جو مجھے حاصل ہے؟۔

یہ تو صحیح ہے کہ جب میں لال بتی اور ہوٹر والی کار میں بیٹھ کر گذروں گا تو پولیس اہلکاروں سے لے کر نہ جانے کتنے لوگ مجھے سلامی پیش کریں گے ـــــ مگر جن ہاتھوں سے مجھے یہ عہدہ ومنصب ملے گا، وہ پھر میرا بڑا بن جائے گا۔ پھر کہانی الٹی ہو جائے گی۔ منتری جی مجھے دیکھ کر نہیں کھڑے ہوں گے، بلکہ مجھے ان کو دیکھ کر کھڑا ہونا پڑے گا؟۔ یہ ہاؤ بھاؤ تو چند دنوں کا ہوگا، اور میں اپنی ''آج کی حیثیت'' سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں گا ـــــ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ سودا گھاٹے کا ہے یا فائدہ کا؟۔

معین صاحب میرے اس طول طویل جواب کو سن کر یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ اللہ کی قسم آپ کا جواب نہیں۔

ہمارے قارئین اسے میری کمزوری کہیں، بے صلاحیتی کہیں، یا احساس کمتری قرار دیں، مگر اپنا تو یہ سوچا سمجھا فیصلہ رہا ہے کہ

ے

میری غزلوں سے تم جانِ محفل بنو
میرے حصے میں تنہائیاں آئیں گی

حالاں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ''الٹی سمت میں ناؤ چلانے'' کی اس روش نے مجھے ''آج کی رنگ برنگی دنیا'' میں بہت پیچھے کر دیا۔ اور بہت سے لوگوں کی نظروں میں ایک ''غیر معتبر'' اور الول جلول سا آدمی قرار پایا ــــــ اس کے باوجود میں یہ سوچ کر خوش اور مطمئن ہوں کہ

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ ''یار'' سلامت، ہزار مے خانے

میں جی رہا ہوں، اور اپنے رب کے کرم سے بہت مطمئن زندگی گذار رہا ہوں۔ کیوں کہ میرے اللہ کی دی ہوئی میری زندگی کی مہلت ابھی باقی ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کے اٹل خدائی فیصلہ کے مطابق جانا مجھے بھی ہے۔ بس دعا یہ ہے کہ زندگی کی اس مدت میں میرا رب مجھ سے راضی رہے اور اس کی مخلوق کو میری ذات سے کوئی نقصان نہ ہو۔ کسی کے کام آجاؤں تو میرے رب کا یہ مجھ پر خصوصی کرم ہوگا۔

مری حیثیت سے سوا ملا:

زندگی گذارنے کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلہ تو ہونا ہی چاہئے۔ میرے لئے سب سے اطمینان بخش مشغلہ مدرسہ اور اس کے خود اختیاری انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ''البدر'' ہے، جس کے سہارے کچھ نہ کچھ لکھنے کی پابندی نے بہ ہر حال کچھ نہ کچھ تو ایسا لکھوا ہی لیا ہے جسے میں اپنے رب کے حضور پیش

کر کے سرخ روئی کا امیدوار ہوں۔ ''کورونا'' اور لاک ڈاؤن کے دور میں بھی کاغذ و قلم سے رشتہ میرے کام آرہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ دل چسپی کسی اور کے لئے بھی نفع بخش ہوتی ہے یا نہیں؟ مگر مجھے ''نفع عاجل'' تو یہ ملا کہ ''ذہنی وفکری ہراسانی کے دور'' میں بھی کسی اضافی مشقت کے بغیر میری دو کتابیں تیار ہوگئیں ــــ اب آگے کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ قلم کا سفر جاری ہے لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِكَ أَمْراً۔

اس دوران کچھ ''اچھے دوست'' بھی دریافت ہوگئے۔ ان میں سے ایک مرادآباد میں قیام پذیر ڈاکٹر معراج الحسن صاحب ہیں، جن سے ملاقات ہوئے بغیر باہمی الفت واحترام کے ساتھ دوستانہ رشتے قائم ہوگئے۔ واسطہ بس میری تحریریں ہی بنیں، جن میں اللہ جانے ڈاکٹر صاحب جیسے ادیب، استاذ، اور متعدد کتابوں کے مصنف کو ایسا کیا نظر آ گیا کہ وہ میرے عیبوں سے درگذر کرتے ہوئے مجھ سے محبت کرنے لگے، دیکھا سنی ہوئی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ آں موصوف اپنی سادگی کی وجہ سے ''نظر فریبی'' کے شکار ہوگئے؟۔ مگر یہاں تو ایسا بھی کچھ نہیں ہوا۔ بس ڈاکٹر صاحب کا پیغام محبت اچانک ہی فون سے آیا، جس کا سلسلہ تا ایں دم جاری ہے، اور ڈاکٹر صاحب اپنی رسیلی اور پیار بھری آواز سے یہ اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ دل کے نہاں خانوں میں تمہاری جگہ بڑھتی جا رہی ہے۔

میرے لئے تو یہ باعث فخر ہی نہیں، ایک وجہ تعارف بھی ہے کہ کچھ ادیبوں و دانشوروں سے بھی میری شناسائی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہ

جانے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ محبت پروگرام بنا کر کہاں کی جاتی ہے؟ وہ تو بس ہو جاتی ہے ——— اور یہ نعمت بھی ہر ایک کو نہیں ملتی ہے۔ بلکہ

محبت کے لئے ''کچھ خاص دل'' مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

اب جب کہ انہیں مجھ سے محبت ہو ہی گئی، تو دعا ہے کہ اسے بقا و دوام ملے، اور میری طرف سے ایسا کچھ نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنا دامن محبت سمیٹنا پڑ جائے۔

اسی طرح ایک دوسری ''رس بھری شخصیت'' مست حفیظ رحمانی کی بھی اپنے کرم فرما عبدالقدوس ہاشمی صاحب کی نظر عنایت سے ایک خوشنما تقریب کے حوالہ سے دریافت ہوئی۔ طلسماتی دنیا کے ''غیر مرئی کردار'' کی طرح مست حفیظ رحمانی سے اخبارات کے ذریعہ ان دیکھی واقفیت تو تھی۔ جو کبھی جمعیۃ علماء سیتاپور کے حوالہ سے، کبھی کسی ادبی نشست کی صدارت کے حوالہ سے، کبھی مراسلاتی کالم میں، اور کبھی کسی شعری محفل میں رونق محفل کے حوالہ سے جلوہ گر ہوتی رہتی تھی۔ کشش ان کے سہ لفظی ''چیستانی نام'' کی بھی تھی۔ اور اشتیاق یہ تھا کہ کبھی ملاقات کا موقع ملا، تو اس معمہ کو خود ان ہی سے حل کراؤں گا۔ نام اگر حفیظ مست رحمانی ہوتا تو مجھ جیسے کم فہم کا سمجھنا بھی آسان ہو جاتا کہ حفیظ نام کا ایک جز ہے۔ مست تخلص ہے۔ اور رحمانی، نسبت ہے۔ مگر لفظوں کی الٹ پھیر نے میرے لئے اسے ایک چیستان بنا دیا تھا۔

بھاری بھر کم نام نے مسمّٰی کا جو تخیلاتی خاکہ بنایا تھا وہ بھی بھاری بھر کم تھا۔ کیوں کہ اتنا بھاری بھر کم نام کسی ہلکی پھلکی سراپا والی شخصیت پر کیوں کر زیب دے سکتا تھا؟ مگر بھائی عبدالقدوس نے اپنی محبتوں کا ایک نیا باب کھولتے ہوئے جب میرے گھر تشریف لاکر مست حفیظ رحمانی صاحب کا حمد و نعت و منقبت پر مشتمل مجموعہ کلام ''عکس معرفت'' دیتے ہوئے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ عیدگاہ کے نوتعمیر میٹنگ ہال میں، اس کتاب کی رسم اجرا ہونی ہے جس میں آپ کو بھی اس کتاب پر کچھ اظہار خیال کرنا ہے۔ اس تقریب میں آپ کو میں اپنی طرف سے بھی، اور مست حفیظ صاحب کے اصرار پر ان کی طرف سے بھی شرکت کی دعوت دینے آیا ہوں۔ ان کی زبانی یہ سن کر مجھے اس خبر سے مسرت ہوئی کہ مست حفیظ صاحب بھی مجھے جانتے ہیں، اور اس لائق سمجھتے ہیں کہ ان کے مجموعہ کلام (یعنی شاعری) پر میں بھی کچھ اظہار خیال کر سکتا ہوں؟ یہ خبر میرے واسطے اس لئے بھی باعث مسرت تھی کہ میری شناخت تو بس ایک جیسے تیسے ''مولوی'' ہی کی ہے — اور کیا کوئی باقاعدہ قسم کا شاعر کسی میرے جیسے مولوی کو بھی اس لائق سمجھتا ہے کہ وہ اس کی شاعری پر کچھ اظہار خیال کر سکے؟ عموماً ''شعر و ادب کے جاگیردار'' تو ہمارے اکابر علماء کو بھی اس لائق نہیں سمجھتے کہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا ایک ہزار سے زائد اردو زبان میں تحریر کرنے والی کتابوں کا مصنف بھی اس لائق قرار پا سکے کہ اس کا شمار بھی اردو زبان کے خدمت گذاروں میں ہو، جب کہ ان کی تصانیف میں قرآن مجید کی مرجعیت حاصل کرنے والی تفسیر ''بیان

القرآن'' سے لے کر ''بہشتی زیور'' جیسی ''انسائیکلوپیڈیا'' قرار پانے والی کتابیں بھی شامل ہیں؟——اس کے مقابلہ میں ''اردو کے مایہ ناز ادیب و شاعر'' قرار دیئے جانے والوں میں ایسے نام بھی شامل ہیں جن کی ''متاع خدمت'' کا دائرہ دو چار ہزار صفحات تک بھی نہیں پہنچ سکا؟۔ ہاں بس ان کی یہ ''خوبی'' ضرور ہے کہ یا تو وہ مذہب بیزار اور دہریئے ہیں، یا کسی ایک ''خاص مذہبی نقطۂ نظر'' کی ترجمانی کرنے والے ہیں؟۔

بہر حال بھائی عبدالقدوس صاحب کے اصرار پر میں ڈرتے ڈرتے اس ''بزم ادیباں'' میں شرکت کے لئے حاضر ہوا تو ''اپنے فرض کی ادائیگی'' اور محفل کے اختتام کے بعد ایک نحیف الجثہ بزرگ سے بہ حیثیت مست حفیظ رحمانی کی تعارف ہوا۔ ابتداءً تو انہیں ''اپنے تخیلاتی خاکہ'' کے مطابق نہ پاکر ایک جھٹکا سا لگا، مگر کچھ ہی دیر کی گفتگو کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ ان کا ''بڑا سا نام'' ان کے جسم و جثہ کی وجہ سے نہیں، ان کے دائرہ خدمت، شیریں سخنی، اور حسن اخلاق کی وجہ سے ہے۔ ان سے وہاں ملاقات تو بہت مختصر رہی، جس کے بارے میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہی ملاقات اب تک کی طویل ملاقات بھی رہی، وہاں چوں کہ اور بھی بہت سے قدر دان اور چاہنے والے تھے، اس لئے کوشش کے باوجود شاید اس سے زیادہ طویل ملاقات وہ مجھ سے کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس موقع پر ان کے ساتھ سیتاپور سے ان کے متعدد چاہنے والے بھی آئے تھے۔

یہ ملاقات اگرچہ بہت مختصر اور تشنہ سی رہی لیکن ان کی موہنی شکل

وصورت اور میٹھے میٹھے عاجزانہ و منکسرانہ لب ولہجہ نے اسی وقت مجھے اپنا اسیر کرلیا۔ ان سے فون پر بات کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسہا برس پرانے پوشیدہ جذبات کا تبادلہ ہو رہا ہے؟ دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آواز کو دیر تک اور دور تک سناتا رہے۔

خلاصہ یہ کہ میرے لئے دل سے قریب ہونے والے ''نو دریافت لوگوں'' میں مست حفیظ رحمانی صاحب کا اہم مقام ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری دونوں سے مجھے متاثر کیا۔ اپنی تحریر و تقریر دونوں کے ذریعہ اپنے نام کے اجزائے ترکیبی کی دل چسپ تشریح بھی کی اور وجہ تسمیہ بھی بتائی، جو بجائے خود دلچسپ بھی ہے اور قابل احترام بھی۔ میری نظر میں وہ ایسے لوگوں میں سے ہیں جن سے مل کر تو خوشی ہوتی ہی ہے، ان کے تصور سے بھی مسرت آمیز گدگدی ہونے لگتی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک کڑی نئے رنگ و روپ میں ملنے والے بھائی عبدالقدوس ہاشمی صاحب کی شخصیت بھی ہے، جن سے ضلع جمعیۃ علماء لکھنؤ کے حوالہ سے ملاقاتیں تو برسوں سے ہو رہی تھیں اور ان کی صلاحیتوں کا مجھے اعتراف بھی تھا۔ وہ مجھے اول دن سے ہی ایک مہذب و شائستہ اور جہد پیہم کے حامل انسان نظر آئے۔ نیز ان کی کئی خوبیاں مجھے قابل رشک بھی نظر آئیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مختصر مدت کی نشستوں کی ملاقاتوں میں ان کی تمام قابل ذکر خوبیوں کو سمجھا نہیں جا سکتا تھا، نہ ان کا اظہار و بیان ممکن تھا۔ اسے میں اپنے پروردگار کا ایک انعام ہی قرار دوں گا کہ اس نے بھائی عبدالقدوس

صاحب کو کچھ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع عطا کیا تو ان کی ایک نئے رنگ وروپ کی شخصیت سے تعارف حاصل ہوا۔ ان سے کھل کر ملنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا کہ ان کے دل میں بھی میرے لئے بڑی جگہ ہے اور وہ مجھ سے اللہ واسطے کی اتنی محبت بلکہ ''تقرب'' رکھتے ہیں جتنی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔؟

پھر جب موصوف کے جوہر کھلے تو وہ کام کے آدمی نظر آئے اور چپکے چپکے انہوں نے اپنی مقبولیت کا دائرہ کافی وسیع کر رکھا ہے۔ میں نے تو اپنی عمر کے تجربات کی روشنی میں اپنے آپ کو ''بہت بڑا پارکھ'' سمجھتے ہوئے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں نے ایک نئے رنگ وروپ والے عبدالقدوس ہاشمی کو دریافت کیا ہے۔ مگر ان سے قربت بڑھتے ہی میری ''ساری خوش فہمی'' کافور ہوگئی، اور یہ اعتراف کرتے ہی بنی کہ ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

بہ ہر حال یہ سوچ کر قرار آ گیا کہ اکیلا نہ سہی، بہت سے دوسروں کے ساتھ میں بھی ان کے شناساؤں میں شامل ہوں ــــ اور یہ ''خوش فہمی'' تو اب بھی قائم ہے کہ میری شناسائی میں کچھ امتیاز تو ہوگا ہی ــــ دیکھئے اس ''خوش فہمی'' کا بھرم بھی کتنے دن قائم رہتا ہے؟؟ ویسے وہ تو مجھ پر یہی ظاہر کرتے ہیں کہ تمہارا امتیاز ہے ــــ مگر اس کا کیا بھروسہ کہ وہ اپنے تمام شناساؤں سے یہی کہتے ہوں؟۔

ناقابل فراموش شخصیتیں:

اس دنیا میں موت اور زندگانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی دن کوئی گھنٹہ ان دونوں سے خالی نہیں ہوتا، اس دنیا کی سب سے سچی، لیکن کڑوی حقیقت کا نام موت ہے۔ یعنی ہر ہستی کے لئے نیستی لازمی ہے۔ مالک کائنات نے کل من علیھا فان کا بے لاگ قانون ایسا بنایا کہ اس سے کسی کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ اپنے محبوب ترین بندوں یعنی انبیاء کرام کو بھی اس سے گذار کر یہ واضح کر دیا کہ رعایت کسی کے ساتھ نہیں ہے۔

جہاں کوئی گھنٹہ بھی زندگی اور موت کے کھیل سے خالی نہ ہو، وہاں عمر رواں کی طویل مدت کا میرے جیسا لاابالی تو کیا، بڑے سے بڑا جوڑ گھٹاؤ کا حساب رکھنے والا بھی تفصیلی اور مکمل چارٹ نہیں پیش کر سکتا؟۔ اپنی یادداشت کے سہارے اگر حالیہ ۲۸-۲۹ ربرسوں کے حوالہ سے ہی ''ناقابل فراموش شخصیتوں'' کا ذکر کرنا چاہوں، تو بھی مجھے یقین ہے کہ بھول بھٹک ضرور ہوگی۔ اس لئے ''خیریت'' اسی میں ہوگی کہ اسے ''بھول'' کے خانہ میں ڈال کر اپنے کو ''خطروں اور الزامات'' سے بچا لیا جائے ــــ البتہ کچھ ایسی ناقابل فراموش شخصیتوں کی جدائی کا صدمہ اس مختصر مدت میں بھی برداشت کرنا پڑا۔ جنہیں یادیں زندگی کی آخری سانس تک بھی شاید جدا نہ کر سکیں ــــ ان میں پہلی شخصیت اس مختصر مدت کے آغاز پر یعنی ۳-۴ رجون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں احساس محرومی عطا کر کے جدا ہونے والی اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحب کی ہے۔ باپ جیسی شفیق و بے لوث شخصیت

کا سایہ کسی بھی عمر میں اٹھنا، ہر حساس و باشعور انسان کو احساس محرومی سے دو چار کرتا ہے، اور ہماری اس فانی دنیا کے لئے یہ کوئی نئی نرالی بات بھی نہیں ہے ——— تاہم میرا ''احساس محرومی'' اپنی حرماں نصیبی یا ناقدری کی وجہ سے اس لئے جداگانہ ہے کہ نہ صرف ان کی شفقتوں، بلکہ شخصی کمالات، حلقۂ اثر، اور بے ضرر و بے مثل انداز تربیت سے منافع تو خوب خوب حاصل کئے۔ اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ آج قلم پکڑنے کی صلاحیت سے لے کر میں جو کچھ اور جیسا کچھ ہوں، ان ہی کے فیضان نظر سے ہوں۔ لیکن اب جب کہ وہ ہماری نظروں سے دور، اتنی دور کہ پھر اس دنیا میں کبھی نظر نہ آسکیں گے، چلے گئے تو با فکر پشیماں و با دیدۂ گریاں یہی سوچنا اور کہنا پڑتا ہے کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدردانی کی مجھے بھی تو کچھ فکر کرنا چاہیے تھی؟ مگر اپنا ضمیر خود ہی اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہے کہ ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پھر اس کے بعد ۱۹۹۸ء میں عارف باللہ ولی کامل حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ جیسی بے استحقاق شفقتوں و محبتوں کی بارش کرنے والی شخصیت، دوسری صدی عیسوی کے اختتام پر عالم اسلام کی اس وقت کی سب سے مؤثر و طاقتور آواز مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ کا سانحۂ وفات، اور اس کے عالم گیر اثرات، اسی طرح میرے آخری استاذ خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے ظل ہمایونی سے محرومی، ۲۰۱۴ء میں ''بیٹا'' کہہ کر مخاطب کرنے والی آخری شخصیت اور دادا نانا کی عمر کو پہنچ

جانے کے باوجود مجھے کم عقل و ناتجربہ کار ''بچہ'' سمجھتے ہوئے کبھی پیار سے تو کبھی ڈانٹ کر فہمائش کرنے والی والدہ ماجدہ کی اس دنیائے فانی سے رخصتی۔ کنبہ کے قریب ترین اعزہ میں پہلے سب سے بڑی بہن صاحبہ کے جوان العمر اور شادی شدہ منجھلے بیٹے عبدالحنّان، پھر ان کے والد یعنی میرے بڑے بہنوئی سید محمد عرفان عالم صاحب، اس کے کچھ ہی وقفہ کے بعد ان کے بڑے بیٹے اور میرے والدین کی دوسری نسل کے چہیتے فرد مولانا عبدالمنان قاسمی استاذ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری، اور آخر میں چند ماہ قبل میرے منجھلے بہنوئی حفیظ اللہ صاحب کی بالکل اچانک بات کرتے کرتے چند منٹ کے اندر اس دنیائے فانی سے رحلت، اور پھر اس کے کچھ ہی وقفہ کے بعد سب سے بڑی ہمشیرہ کی اسی طرح رخصتی نے ذہن و دماغ کو بہت متاثر کیا۔ عبدالحنان مرحوم کے بعد کنبہ کے بقیہ چار افراد کی رحلت اتنے کم وقفہ میں ہوئی کہ سارے کنبہ پر غموں کے بادل چھا گئے، جس کا اثر میرے معمولات پر بھی پڑا۔ البدر کے اپنے لازمی کالموں کو تو جیسے تیسے لکھنا اس لئے ضروری تھا کہ رسالہ کی اشاعت بہ ہر حال ہر ماہ ہونا ہی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کافی عرصہ تک کچھ اس طرح جمود طاری رہا کہ ارادہ اور کوشش کے باوجود بھی کوئی قابل ذکر تحریر نہیں آسکی۔ اتنا مجھے بھی معلوم ہے کہ ہر جاندار کے لئے موت لازمی ہے، اور اپنے چہیتوں کو کھونے کا صدمہ بڑے بڑے اکابر و اولیاء اللہ کو بھی برداشت کرنا پڑا ہے، اور ایسے مواقع پر انہوں نے راضی برضائے الٰہی رہ کر جس مثالی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ہم جیسے گنہگاروں کے لئے

نشانِ عبرت ہے۔ تاہم اسی تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے سرورِ کائنات اور پیکر صبر وثبات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب اور چہیتی و پہلی بیوی سیدہ خدیجہؓ کی جدائی سے اس درجہ رنجور ومحزون ہوئے تھے کہ اس پورے سال ہی کو تاریخ اسلام میں عام الحزن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خرد سال اور آخری فرزند سیدنا ابراہیم کی وفات پر تو نبی کی آنکھوں نے بھی آنسوؤں کی برسات کر دی تھی۔ اور صبر کے پہاڑ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح زار وقطار آنسوؤں کی برسات کرتے دیکھ کر جب وفا پیشہ غلاموں یعنی صحابۂ کرامؓ نے اپنی حیرت وفکر مندی کا اظہار کیا تو نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی جواب تھا کہ یہ تو وہ فطری تقاضا ہے جو جذبۂ رحمت کی دین ہے، جس پر کسی آدمی کو اختیار نہیں ہوتا۔ البتہ نبی نے اپنے خاموش آنسوؤں کو حزن ورنج کا ترجمان وشارح بنا کر اپنی امت کو یہ تعلیم بھی دے دی کہ ہموم وغم وآلام کے موقع پر بھی نالۂ وشیون کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اظہارِ غم کے لئے آنسو ہی کافی ہیں جس کا بیان اس طرح ہو سکتا ہے کہ ؎

یوں ہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
جایئے آپ کوئی بات نہیں

اسی مدت کے دوران گھر اور خاندان کے باہر، اور ''تکیہ، سجادہ نشین اور عرس و''قوالی'' جیسی اصطلاحات سے وابستہ ایک ایسی منفرد ''شاہ اور میاں'' سے یاد کی جانے والی شخصیت کی رحلت بھی ہوئی جن سے کچھ بہت گہرا تعلق تو نہ تھا، لیکن جیسا اور جیسا کچھ تھا، باوقار بھی تھا اور مسلکی تعصبات

سے بری وپاک بھی تھا۔ میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اپنے قصبہ کاکوری کی خانقاہ کاظمیہ کے موجودہ سجادہ نشین اور مجھے اپنی خصوصی محبتوں سے نوازنے والے بھائی شاہ عین الحمید رعرف ضیا میاں کے والد ماجد شاہ مصطفی حیدر عرف اڈن میاں مرحوم کا جو اپنے خانقاہی نظام ومعمولات کی وجہ سے بھی، اور اپنے بعض ذاتی اوصاف کی وجہ سے بھی میری یادوں سے وابستہ رہ جانے والی شخصیات میں سے ایک تھے۔ مرحوم کی ایک بات جو مجھے بے حد متاثر کرنے والی تھی، یہ تھی کہ اس قسم کی خانقاہوں سے وابستہ افراد میں عمومی طور پر شریعت کے احکام مثلاً نماز وروزہ، اور حج جیسی عبادات کا وہ اہتمام دیکھنے کو نہیں ملتا جو ہونا چاہئے۔ اس کی ایک خود ساختہ تاویل بھی یہ پیش کر دی جاتی ہے کہ شریعت اور چیز ہے طریقت اور چیز، چوں کہ طریقت کا مقام شریعت سے بلند ہے، اس لئے جوں جوں طریقت میں مراتب بلند ہوتے جاتے ہیں شریعت کی پابندیاں ڈھیلی ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ''مقامِ حضوری'' پر فائز ہو جانے والے کے لئے تو کعبہ مکرمہ پیش کر دیا جاتا ہے، اور اسے مسجد جا کر باجماعت نماز ادا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ میرے علم میں ایسے کئی ''نیک نام'' بزرگ ہیں جن کے بارے میں اس قسم کے گمراہ کن دعوے کر کے ان بزرگ کو بھی اپنی گمراہی میں حصہ دار بناتے ہوئے اپنے آپ کو بھی ''ان کی تقلید میں'' شریعت کی پابندیوں سے آزاد کر لیا جاتا ہے؟۔ ایسا کرنے والے یہ ظاہر کرتے ہیں (اور ممکن ہے کہ انہیں دل سے بھی اس کا یقین ہو) کہ وہ اپنے بزرگ کی عقیدت ومحبت میں ڈوب کر ان کے فضائل

وکمالات بیان کررہے ہیں؟ حالاں کہ ’’ان نادان دوستوں‘‘ کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے اس اٹل سچائی پر غور کرنا چاہئے کہ اس کائنات میں اللہ کے حبیب ومحبوب سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا نہ کوئی بزرگ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے، جن کے سامنے تو صلح حدیبیہ کے نازک موقع پر بھی کعبہ نہیں پیش کیا گیا کہ وہ اوران کے طفیل میں ان کے کم وبیش چودہ سو وفادار غلام طواف کرکے اپنے مقصد سفر کو پورا کرلیتے اور باحسرت وغم اسی جگہ قربانی دے کر واپس نہ آتے؟۔ پھر بزرگوں کی بزرگی کو اپنے خودساختہ پیمانوں سے ناپنے والوں کو اس طرف بھی توجہ کرنا چاہئے کہ اس کائنات کے خالق ومالک نے اپنے بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے پیمانہ صرف اپنے چہیتے وآخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہوئے اپنے کلام مجید میں سے فرماکر واضح اور واشگاف اعلان کردیا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (یعنی اے بندو! تمہارے لئے اللہ کے (آخری) رسول کی عملی زندگی میں (سیدھی ڈگر پر چلنے کے لئے) بہترین نمونہ موجود ہے) اوران اللہ کے آخری وسچے رسول نے تو ہمارے لئے یہ نمونہ پیش کیا کہ اپنے مرض الوفات میں بھی جب کہ تمام جسمانی قوتیں جواب دے چکی تھیں، اوراس حال میں کہ مرض کی نقاہت وکمزوری کی وجہ سے پیر بھی زمین پرنہیں جم رہے تھے، اپنے پیروں کو گھسیٹتے ہوئے باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے مسجد تشریف لے گئے اور ابوبکر صدیق ؓ کی اقتدا میں نماز ادا کرکے ’’اپنے صدیق‘‘ کے امتیاز کو بھی واضح کیا، اور عملی طور پر یہ بھی بتایا کہ ان کے لئے بھی

زندگی کی آخری سانس تک نہ نماز کی معافی ہے نہ ہی نماز کی خاطران کے لئے کعبہ لایا جاتا ہے ـــــ تو پھر کیا ان کے نام لیواؤں اوران کی غلامی کی زنجیر اپنے گلے میں ڈالنے والوں میں سے کسی کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ اس کے لئے کعبہ حاضر کیا جائے؟ کسی واقعی بزرگ سے تو ایسے فاسد عقیدے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اور بزرگ کی طرف ایسے فاسد عقیدے کی نسبت کرکے ان کی ’’بزرگی میں چار چاند لگانے‘‘ کی کوشش کرنے والوں کو ’’شیطان کے چیلوں‘‘ کے سوا کس نام سے یاد کیا جاسکتا ہے؟۔

ہمارے قصبہ کاکوری کی مذکورہ بالا خانقاہ میں بفضلہٖ تعالیٰ اس گمراہی کو دخل نہیں ہے، اور خانقاہ کے کمپاؤنڈ میں مسجد ہے جس میں باجماعت نماز پنج گانہ ہوتی ہے۔ اور وہاں کے لوگ اپنے لئے کعبہ حاضر کرانے کے بجائے خود مسجد میں حاضری دے کر نمازیں ادا کرتے ہیں۔ خصوصاً ’’مذکورہ بالا بزرگ‘‘ اڈن میاں مرحوم نہ صرف سختی کے ساتھ نماز باجماعت کی پابندی کرتے، بلکہ اپنی وضع قطع، شکل وصورت، اور ظاہری اخلاق وعادات کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو ’’پابند مسلمان‘‘ ثابت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے تو اپنے خانوادہ کی دیرینہ روایت کو توڑتے ہوئے حج بیت اللہ کرکے اپنے اخلاف کے لئے ایک ’’راہ سعادت‘‘ کی بنیاد بھی رکھی، جس کا نقد فائدہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں دیکھ بھی لیا؟

مجھے نہیں معلوم کہ اڈن میاں مرحوم کے اسلاف نے حج بیت اللہ کے

لئے پیش قدمی کیوں نہیں کی؟ ایک مرتبہ ذکر آنے پر بھائی ضیا میاں نے اجمالی طور پر جو کہا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ''فقیر لوگ'' تھے — مگر میری حلق سے یہ بات اس لئے نہیں اتر سکی تھی کہ پھر کیا اڈن میاں مرحوم ''فقیر'' نہ تھے؟ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ حق تعالیٰ کی نوازش کے لئے ان ہی کی طرف سے انتخاب ہوتا ہے، اور ضیا میاں کے والد ماجد مرحوم کا انتخاب اس سعادت کے حصول کے لئے حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تھا۔ وذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

یہ اور اس جیسی چیزوں کو ہی میں نے اڈن میاں صاحب مرحوم کے ''ذاتی اوصاف'' سے تعبیر کیا ہے — اور ظاہر ہے کہ کسی ایک ''خصوصی فضیلت'' کی وجہ سے ان کے اسلاف کی ''مجموعی عظمتوں'' پر کچھ اثر نہیں پڑتا ہے۔

حالیہ دو برس کے ''کورونا دور'' میں تو عالم فنا کو چھوڑ کر عالم بقا کی طرف منتقل ہونے والوں کی ایک جھڑی لگ گئی۔ کس کو یاد کروں کس کو بھلاؤں؟

ہائے کیسے کیسے ہشاش بشاش، چاق و چوبند، اپنے و بیگانے ''کورونا'' کی نذر ہو گئے یا نذر کر دیئے گئے؟۔ ہمسروں سے لے کر خرد وکلاں تک کی ایک قطار ہے جس میں سے کتنوں ہی کو ہم شہید یا مظلوم یا مقتول کے نام سے بھی یاد کر سکتے ہیں۔ غالباً اپنوں میں سب سے پہلے مولانا متین الحق اسامہ قاسمی کی موت کی اطلاع اس طرح ملی تھی کہ فجر کی نماز کے بعد مسجد سے گھر واپسی ہوئی تو اپنے فرزندان مفتی حارث، سالم عبدالرحیم، اور

معاویہ عبدالرحیم کو خلاف معمول اپنے کمرہ میں انتہائی ملول و پژمردہ حالت میں پا کر میرا ماتھا ٹھنکا، میرے استفسار پر انہوں نے انتہائی غم کے ساتھ اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دی تو اچانک اور بغیر کسی بیماری کے یہ اطلاع پا کر جیسے سارے وجود پر سناٹا چھا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا اسامہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وہ مجھ جیسے کاہلوں کے لئے ''حرکت و برکت'' کا ایک نمونہ تھے۔ مگر مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے عمر میں اتنے چھوٹے ہیں، یہ تو مجھے میری پھوپھی صاحبہ نے بتایا کہ اسامہ تو ان کے سب سے چھوٹے بیٹے خالد سلّمہ سے بھی چھوٹے تھے۔ بعد کو جب ان کی تاریخ پیدائش کی تفصیلات سامنے آئیں تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

اسامہ قاسمی مرحوم پر فارسی کی یہ مثل بالکل صادق آتی ہے کہ ''خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود''۔ انہوں نے اپنے رب کی عطا کی ہوئی تھوڑی سی عمر کو اس طرح عجلت کے ساتھ استعمال کیا جیسے ان کو قضائے غیبی کی اطلاع ہو گئی ہو؟ یوں تو اسامہ مرحوم سے بالواسطہ طور پر میری قرابت داری بھی تھی، مگر وہ اپنی فطری و تربیتی صالحیت کی بنا پر میری واقعی حیثیت سے بڑھ کر میرا احترام کرتے تھے۔ اسامہ مرحوم کی پرورش و تربیت جس ماحول میں، اور جس باپ کی سرپرستی اور جس ماں کی گود میں ہوئی اس کی چھاپ ان کی زندگی کی ایک ایک ادا میں نظر آتی تھی۔ وہ حضرت مولانا مبین الحق قاسمی مرحوم جیسے ملنسار، مخلص اور باکردار آدمی کے فرزند صالح اور ان کے سچے جانشین تھے۔

دوسری طرف انہوں نے جس ماں کی گود میں پرورش پائی تھی وہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کے مدرسہ کے صدرالمدرسین اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا نفیس اکبر صاحبؒ کی سالی، اور موجودہ شیخ طریقت برادرم مولانا محمد طلحہ قاسمی صاحب کی خالہ تھیں۔ انہیں اپنے بڑوں اور ہمسروں کی صالحیت کے ساتھ ساتھ حضرت قاری صدیق صاحب باندویؒ جیسے ولی کامل کی خصوصی سرپرستی بھی حاصل تھی ـــــ پھر کیوں نہ وہ ایک ''نیر تاباں'' بن کر چمکتے؟ مجھے اچھی طرح وہ وقت بھی یاد ہے جب شہر کانپور میں حضرت مولانا مفتی منظور احمد مظاہریؒ کے زیر اہتمام اور مولانا مبین الحق قاسمی کے زیر نظامت منعقد ہونے والے ''سیرت صحابہؓ'' کے تاریخی اجلاس میں، اور کانپور کے دیگر بڑے جلسوں میں ایک مقرر کی حیثیت سے شرکت کے لئے جاتا تو اسٹیج پر اس وقت کے ''ننھے اسامہ'' بھی اپنے والد مرحوم کے ارد گرد منڈلاتے نظر آتے۔ گوری چٹی رنگت، اور پابند شریعت لباس کے ساتھ اپنی اچھل کود سے وہ اس وقت بھی اپنے بڑوں کے مرکز نگاہ بن جایا کرتے تھے، اور یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ذرہ ایک دن آفتاب بن کر ضرور چمکے گا۔ اور پھر یہی ہوا کہ کانپور جیسے مدارس وعلماء سے معمور شہر میں انہوں نے اپنی ایک منفرد وامتیازی شناخت بنائی، اور آج جب کہ ہماری اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی جدائی کا کرب، اور ان کی وفات سے خالی ہونے والی جگہ کی بھرپائی کی فکر اپنوں و ''بیگانوں'' سب ہی کو بے چین کئے ہوئے ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے رہتے ہیں اور مے خانہ خالی ہے

عقائد میں تصلب، اور پوری جرأت وبے باکی کے ساتھ اس کا اظہار، انہیں اپنے خاندانی بزرگوں کی وراثت کے ساتھ ساتھ اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی مبارک نسبت سے ملا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے وفا شعار اصحاب کرامؓ سے عشق کی حد تک محبت، اور کسی لاگ لپیٹ کے بغیر پوری جرأت وبلند آہنگی کے ساتھ اس کا اظہار، انہیں ان کے اساتذہ کرام و دیگر بڑوں کی خصوصی توجہات کا فیضان قرار دیا جائے گا۔ وہ کانپور کے ایک بڑے دینی مدرسہ جامعہ محمودیہ اشرف العلوم کے بانی وناظم اور جمعیۃ علماء یوپی کے صدر ہونے کے ساتھ ہی متعدد دینی وملّی تنظیموں سے قائدانہ طور پر وابستہ تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اتنی مفید وکارآمد اور ہمہ رنگ شخصیت کا اس طرح ''کورونا'' کی بھینٹ چڑھ جانا، فطری وطبعی موت کے مقابلہ، ہر حساس انسان کے لئے نہایت ہی کربناک وپرفکر ثابت ہوا۔ جس میں اپنے خصوصی تعلق کی وجہ سے یہ راقم الحروف بھی شامل رہا، مگر ـــ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

اسی طرح رمضان ۱۴۴۲ھ میں پھوپھی زاد بھائی مولانا قاری امین الاسلام اور بچپن کے ساتھ کھیلے کودے دوست سید قمر الحسن اسی ''کورونا'' کے عفریت کی نذر ہو کر اپنے پیچھے ڈھیر ساری یادیں چھوڑ کر داغ مفارقت دے گئے۔

میری پانچویں نمبر کی پھوپھی مرحومہ کے فرزند اکبر برادرم قاری امین الاسلام یوں تو حافظ وقاری ہونے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند سے

با قاعدہ سند یافتہ ''فاضل'' بھی تھے، مگر ان کی اصل شناخت اور ذاتی دلچسپی ''قاری قرآن'' کی تھی۔ وہ جب اپنے دلکش لب ولہجہ میں تلاوت قرآن کرتے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ قرآن مجید کے ساتھ ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ان کے لب تلاوت کلام اللہ سے حرکت میں رہتے، حتیٰ کہ کسی مجلس احباب میں بھی کوئی لمحۂ فرصت ملتے ہی خود بہ خود ان کے لبوں پر تلاوت کلام اللہ جاری ہو جاتی۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی بہرائچ سے لے کر دیو بند تک جہاں رہے کسی نہ کسی مسجد کے منصب امامت سے وابستہ ہو کر تلاوت کلام ربانی سے اپنی آسودگی کا سامان کرتے رہے۔ حق تعالیٰ کو اپنے کلام کے ساتھ ان کا یہ والہانہ عشق ایسا بھایا کہ ان کا ذریعہ معاش بھی اپنے کلام کی تلاوت سے وابستہ کر دیا۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کی ملازمت کے ذریعہ وہاں کی متعدد مساجد کی امامت سے وابستہ رہتے ہوئے آخر میں جامع مسجد کے امام مقرر ہو کر اسی منصب پر رہتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔

اس ملازمت اور ذریعہ معاش کے ساتھ ہی اعزازی طور پر بھی وہ اپنا شوق تلاوت یوں پورا کرتے رہے کہ خاندان اور خاندان کے باہر کے متعدد بچوں کو انھوں نے ناظرہ وحفظ قرآن کرادیا ــــ گویا قرآن مجید کے ساتھ ان کے لگاؤ اور عشق کا عالم کچھ یوں رہا کہ ؎

غیروں کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
مجھ کو تو ''محبت'' کے سوا کچھ نہ رہا یاد

قرآن مجید کے ساتھ یہ والہانہ محبت انہیں وراثت میں اپنے والد ماجد اور میرے پھوپھا قاری محمد ظہیر الاسلام صاحب مرحوم سے ملی تھی، جن کے وہ ایک لائق وہونہار شاگرد بھی تھے۔ ویسے تو پھوپھا صاحب مرحوم کے ان کے علاوہ اور بھی ماشاء اللہ پانچ فرزند ہیں، اور سب ہی کم وبیش ''قرآن یافتہ'' بھی ہیں اور درست لب ولہجہ میں تلاوت قرآن پر قدرت بھی رکھتے ہیں، مگر امین الاسلام مرحوم قرآن مجید کے سلسلہ میں اپنے والد ماجد کے حقیقی جانشین بھی تھے اور ان شاء اللہ ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بھی بنیں گے۔

اس امتیازی شناخت کے علاوہ برادرم امین الاسلام مرحوم اپنی خوش اخلاقی، اقربا نوازی، اور مرنجا مرنجی کی وجہ سے بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ وہ میرے چھوٹے بھائی ضرور تھے لیکن جتنا مجھے وہ احترام دیتے تھے اتنا عمر میں چھوٹے نہیں تھے ــــ اور یہ ان کا ایک امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ جب وہ اپنے ماموں یعنی میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے آتے تو سلام ومصافحہ کے بعد موقع ملتے ہی ''ماموں صاحب'' کے پیر دبانے اور اس کے صلہ میں دعائیں حاصل کرنے لگتے تھے۔ اور یہ ان کی سعادت مندی اور اپنے بڑوں کے ساتھ حسن سلوک ہی کا اثر تھا کہ ایک ''ماموں صاحب'' ہی نہیں، بلکہ ان کے تمام بڑوں کو ان سے ایک ''الگ قسم کا'' تعلق تھا ــــ اور میرے خیال میں یہ بھی جانبین کے اس ''تعلق'' کا ہی کرشمہ تھا کہ جب ۳/۴ جون ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں لکھنؤ کے ''سحر نرسنگ ہوم'' میں ان کے ماموں صاحب کا

وقت موعود آیا تو ان کے پاس ان کے تین ہی چہیتے تھے۔ باقی سب اس نو بیاہتا دولہن کے استقبال کی ہماہمی میں لگے ہوئے تھے جو ان کی سب سے چھوٹی بہو کے روپ میں ان کا وقت موعود آنے سے چند گھنٹے پہلے ہی بیاہ کر گھر آئی تھی۔ والد ماجد یعنی امین الاسلام کے ''ماموں صاحب'' کی وفات کے وقت، میرا یا میرے بہنوئی بھائی حفیظ اللہ صاحب مرحوم کا گھر کی ہماہمی چھوڑ کر ہسپتال میں ہونا تو چنداں تعجب کی بات نہ تھی کہ ایسی سنگین حالت میں لکھنؤ اور گھر پر رہتے ہوئے اگر ہم بھی ان کے پاس نہ ہوتے تو کون ہوتا؟ لیکن برادرم قاری امین الاسلام کی موجودگی بس ایک قلبی لگاؤ اور روحانی رشتہ ہی کی غمازی کرنے والی تھی۔ کیوں کہ وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنے چھوٹے بھائی عبدالوحید کی شادی میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ سے آئے تھے، اور ''ماموں صاحب'' کی تشویشناک علالت اور ہسپتال میں بھرتی کی اطلاع پاتے ہی سب کچھ بھلا کر ہسپتال پہنچ گئے تھے، جہاں انہوں نے اپنے محبوب ماموں صاحب کو زندگی کی آخری سانس لیتے ہوئے تو دیکھ ہی لیا تھا۔

اس وقت برادرم قاری امین الاسلام مرحوم کے سلسلہ میں کوئی مفصل مضمون نہیں لکھنا ہے۔ بلکہ برسبیل تذکرہ صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ ''کورونا دور'' میں اب تک جو کچوکے لگے، ان میں سے اس کرب کی شدت بھی ناقابل فراموش ہے ـــــ ویسے یہ حقیقت تو ناقابل فراموش ہے ہی کہ ہمیشہ باقی رہنے والی صرف رب ذوالجلال کی ذات ہے۔

اسی طرح بچپن کے دوست سید قمر الحسن ابن مولانا سید نور الحسن

صاحب مرحوم (سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے بھی اسی رمضان میں اپنی جدائی کے صدمہ سے دوچار کیا ـــــ قمر مرحوم سے میری دوستی اور دوستانہ سلوک کا بھی معاملہ بہت عجیب وغریب قسم کا رہا، جسے میں دو حصوں میں تقسیم کرسکتا ہوں۔ بالفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ دوستی سے آغاز ہوکر دوستی ہی پر اختتام بھی ہوا، لیکن درمیان کے ایک طویل عرصہ کو ''ایام فترت'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس میں ہم ایک دوسرے کے لئے بےگانے، ایک دوسرے سے بےخبر، اور ایک دوسرے کے لئے کسی باہمی نزاع کے بغیر اجنبی سے بنے رہے۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہماری دوستی کا آغاز مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ میں ہوا، جہاں اس وقت مدرسہ کے ناظم قمر کے والد حضرت مولانا نور الحسن صاحب تھے۔ اور ہم دونوں مدرسہ کے دو الگ الگ حفظ کے درجوں میں پڑھتے تھے۔ ہمارے درجہ حفظ (الف) کے استاذ پہلے قاری محمد مظفر صاحب اور ان کے انتقال کے بعد قاری محمد حیدر صاحب تھے۔ جب کہ قمر کے درجہ حفظ (ب) میں ان کے استاذ قاری محمد ایوب خاں صاحب تھے۔ چوں کہ ہم دونوں قریب قریب ہم عمر تھے اس لئے، اور کچھ اس لئے کہ ہم دونوں کے والد علماء میں سے تھے اور دونوں کے درمیان پہلے سے مراسم تھے۔ درجوں کے الگ الگ ہونے کے باوجود ہم دونوں کے درمیان دوستی ہوگئی۔ پھر اس دوستی میں گہرائی کچھ اس وجہ سے اور بڑھی کہ اسی مدرسہ کی نسواں شاخ میں ہم دونوں کی ایک ہم سے بڑی اور ایک چھوٹی بہنیں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اور ان کے درمیان بھی علی قدر مراتب پکی

دوستیاں ہوگئیں۔اس طرح ہم تین بھائی بہن،اور وہ تین بھائی بہن دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔اور ہماری یہ دوستیاں پروان چڑھتے ہوئے مدرسوں سے گھروں تک پہنچ گئیں۔پھر تو ایسا ہونے لگا کہ کسی چھٹی کے دن قمر اپنی بہنوں کے ساتھ میرے گھر آکر صبح سے شام تک کا وقت گذارتے، کھاتے پیتے،کھیلتے اور بچوں کے لئے لکھی جانے والی کتابوں کا تبادلہ کرتے، اور کسی دوسری چھٹی میں اسی طرح ہم اپنی بہنوں کے ساتھ قمر کے گھر پہنچ کر اسی طرح ’’چھٹی انجوائے‘‘ کرتے۔ہمارے گھروں کے دیگر افراد بھی ہماری دوستیوں کو پروان چڑھانے میں ہر طرح کا تعاون دیتے۔اسی درمیان قمر کی ہم سب پر بہت شفقت کرنے والی والدہ (بجیا) کا انتقال ہوگیا۔اور پھر قمر کے والد صاحب ہمارے مدرسہ تجوید الفرقان سے علیٰحدہ ہوکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مقرر ہوگئے۔اور قمر بھی ان کے ساتھ ہی ندوہ منتقل ہوگئے۔

اس کے باوجود ہماری دوستیاں چلتی رہیں،حتیٰ کہ حفظ اور اس کے بعد قرأت کی تکمیل کے بعد میں بھی مدرسہ تجوید الفرقان سے آگے کی تعلیم کے لئے مدرسہ دارالمبلغین آگیا،لیکن ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا،شادی وغمی میں شریک ہونا،اور دوستی کے دور کے تقاضوں کو پورا کرنا جاری رہا۔اب ظاہر ہے کہ ہماری عمریں اور اسی اعتبار سے تعلیمی درجات بھی بڑھ چکے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ پہلے ایک سال مدرسہ نورالعلوم بہرائچ اور پھر اگلے سال اپنی عربی تعلیم کی تکمیل کے لئے میں نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ حاصل کرلیا،جب کہ قمر اس وقت تک ندوہ ہی میں عالمیت کے کورس کی تعلیم حاصل کرتے

رہے۔میرا لکھنؤ شہر چھوٹنے کے باوجود ہم دونوں کے درمیان خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ بنا رہا اور ہماری دوستی ’’گہن لگنے‘‘ کے باوجود قائم رہی۔اور جب میں گھر آتا قمر سے ملاقات ضرور ہوتی۔اس درمیان ہماری بڑی بہنوں کی شادیاں بھی ہوگئیں اور وہ اپنی اپنی سسرال کی ہوگئیں۔اس لئے ہمارا ایک دوسرے کے گھر پابندی کے ساتھ آنے جانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

گھروں کے حالات میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔قمر کے بڑے بھائی سید ضیاء الحسن صاحب کی شادی پہلے ہی ہوچکی تھی۔وہ پہلے الٰہ آباد کے مجیدیہ اسلامیہ کالج میں کچھ عرصہ اردو کے لیکچرار رہنے کے بعد لکھنؤ کے اسلامیہ کالج میں اسی منصب پر فائز ہوکر آگئے۔اور گویا عملی طور پر گھر کے وہی سربراہ بھی ہوگئے۔پھر نہ جانے کیا اور کیسے ہوا کہ قمر سے میرا خط وکتابت کا رابطہ ختم ہوگیا۔اپنے کئی خطوں کے جواب نہ ملنے کے بعد میں نے بھی خط لکھنا بند کردیا——اور پھر جب میں دارالعلوم دیوبند سے تکمیل تعلیم کے بعد سنہ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں لکھنؤ واپس آیا تو علم ہوا کہ قمر نے ندوۃ العلماء کی تعلیم ادھوری ہی چھوڑ کر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے اور اب وہ اپنی وضع قطع،اور ذہن وفکر سے ’’مدرسہ کے طالب علم‘‘ نہ رہ کر ’’یونی ورسٹی کے اسٹوڈنٹ‘‘ بن چکے ہیں؟۔ظاہر ہے کہ پھر یہی ہونا تھا کہ انہوں نے ’’مجھ مُلّا‘‘ سے ترک تعلق کرلیا،اور میں نے بھی یہ سوچ کر ان کی طرف سے صبر کیا کہ ؎

تمہیں بھول جانا تو ہے غیر ممکن
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

قمر کے گھر سے اس کے بعد بھی کسی نہ کسی درجہ کا میرا رشتہ برقرار رہا جس میں ''بھائی صاحب'' یعنی سید ضیاء الحسن مرحوم کی خوش اخلاقی، ملنساری اور خردنوازی کا بھرپور دخل رہا۔ اسی لئے قمر کے علاوہ ان کی دونوں بہنوں اور بھائی سید ضیاء الحسن صاحب اور ہم لوگوں کے درمیان اتنا رشتہ تو قائم ہی رہا کہ ہم ایک دوسرے کی خوشی وغم میں شریک ہوتے رہے۔ قمر لکھنؤ کی رہائش ترک کرکے ملک و بیرون ملک کی خاک چھانتے اور ''اپنا مستقبل سنوارنے'' کی کوشش کرتے ہوئے بالآخر جامعہ ہمدرد دہلی کی آخری ملازمت سے سبکدوش ہوکر اپنے چھوٹے بیٹے نبیل سلّمہ اور اس کے بچوں کے ساتھ نوئیڈا میں مقیم ہوچکے تھے ——— اس درمیان بھائی بہنوں کی خوشی وغمی میں شرکت کے لئے وہ آتے اور میری ان سے ملاقات بھی ہوتی ——— مگر اس طرح کہ ؎

ہے عشق گریزاں کی طرح دل میں تری یاد
شعلے پہ یہ سیماب ٹھہرتا بھی نہیں ہے

ایک طویل مدت اسی ''عالم بےخبری و بےنیازی'' میں گذر گئی، اور بہ ظاہر اس میں کوئی تبدیلی کی توقع بھی نہ تھی کہ اچانک بھائی ضیاء الحسن صاحبؒ کی دل کے آپریشن کے لئے لکھنؤ کے ایرا ہسپتال میں بھرتی، اور پھر چند ہفتوں کے بعد وہیں ان کی وفات کے سلسلہ میں بھائی کی تیمارداری کے لئے کافی عرصہ کے بعد قمر کا لکھنؤ میں طویل قیام ہوا، اور اس دوران ''بھائی صاحب'' کی خیریت دریافت کرنے کے لئے میرا ان سے میسیج کے ذریعہ رابطہ ہوتا رہا ——— اور مجھے کہنا چاہئے کہ بھائی ضیاء الحسن صاحب مرحوم کا یہ

مجھے آخری تحفہ تھا کہ جاتے جاتے انہوں نے مجھے کھوئے ہوئے ''قمر'' سے ایک مرتبہ پھر ملوا دیا۔ مگر وہ جو کاتب تقدیر کے فیصلے میں قمر کی جدائی لکھی جاچکی تھی پوری ہوکر رہی۔ حالاں کہ اس دوران قمر نے اپنے بھائی صاحب کی یاد میں تاثراتی تحریروں کا ایک مجموعہ شائع کیا تو مجھ سے بھی فرمائش کرکے مضمون لکھوا کر اس کتاب میں شائع کیا، پھر تو اپنی قیام گاہ نوئیڈا واپس جاکر بھی انہوں نے فون اور میسیج کے ذریعہ مجھ سے برابر رابطہ قائم رکھا، اور میں نے دنیا کی ناپائیداری کو بھلا کر یہ سمجھ لیا کہ میرا قمر ایک مرتبہ پھر سے مل گیا۔ اگرچہ کچھ اس طرح کہ ؏

عید ہوئی ذوقؔ وَلے شام ہوئی

اب چوں کہ قمر اپنے ''سارے حوصلے'' نکال کر ریٹائرمنٹ کی زندگی نانا دادا بن کر گذار رہے تھے، اس لئے انہوں نے پھر سے مجھے اپنے لئے ''کارآمد'' سمجھتے ہوئے مستقبل کے بڑے بڑے مشترکہ منصوبے بھی بنانا شروع کردئیے تھے۔ وہ بھی بہت پرجوش تھے اور میں بھی خوش ہوہوکر ان کے منصوبوں میں شرکت کے وعدے کررہا تھا ——— مگر انہیں کیا خبر تھی کہ ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

اسی بیچ ایک دن اچانک فون پر قمر نے مجھ سے دریافت کیا کہ کہاں

ہو؟ میرے اس جواب پر کہ رات کا وقت ہے کہاں ہوں گا، گھر پر ہوں۔قمر نے پوچھا ملاقات ہوسکتی ہے؟ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا کہ کیا تم لکھنؤ میں ہو؟ جواب میں انہوں نے کہا، ہاں تمہارے گھر سے بالکل قریب تمہارے پھوپھا مولانا رفیق القاسمی صاحب کے گھر پر ہوں۔تم سے ملے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تمہارے گھر آئے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا، اگر کوئی رہبر مل جاتا تو کام آسان ہو جاتا۔ میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی طارق کے بارے میں پوچھا کہ وہ گھر پر ہیں؟ جواب میں قمر نے کہا کہ ان ہی کے پاس تو اپنی نوطبع کتاب کے سلسلہ میں بیٹھا ہوں۔اور پھر میں نے طارق سے کہا کہ انہیں لے کر گھر آجاؤ۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں غیر متوقع طور پر قمر کو اپنے روبرو پاکر بہت خوشی ہوئی۔طویل شکوے شکایت کے لئے تو ان کے پاس وقت نہیں تھا۔کیوں کہ اگلے دن قیام کے بعد ہی انہیں اپنی اہلیہ اور بیٹے نبیل و بہو کے ساتھ اسی کار سے واپس جانا تھا جس سے وہ لکھنؤ اپنی بھاوج صاحبہ کی عدت پوری ہونے پر ان سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔مختصر وقت میں بھی ''مستقبل کے منصوبے'' سے متعلق کچھ باتیں ہوئیں اور میرے اس ''شکوہ آمیز اصرار'' کے جواب میں کہ اب لکھنؤ آکر تو ایک مرتبہ اپنی فیملی کو میری فیملی سے کل شام کے میرے گھر پر کھانے پر ملوادو؟ کیوں کہ تمہارا معاملہ تو خصوصیت کے ساتھ زبان حال سے کچھ یوں ہے کہ ؎

میکدوں کے بھی آس پاس رہی
گل رخوں سے بھی روشناس رہی

جانے کیا بات ہے کہ اس پر بھی
زندگی عمر بھر اداس رہی

(یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''میکدوں'' سے ''قمر'' کا رشتہ نہیں تھا، مگر چوں کہ شاعر نے شعر اسی طرح نظم کیا اس لئے مجبوراً میکدوں کا ذکر میرے لئے ضروری تھا) میری دوسری تفصیلی ملاقات اور شام کے ساتھ کھانا کھانے کے اصرار پر قمر نے معذرت کرتے ہوئے وقت کی تنگی کے حوالہ سے بتایا کہ کل شام کا کھانا چھوٹی مرحومہ بہن کے شوہر مولانا غیاث ندوی کے ساتھ کھانا ہے۔البتہ میں تم سے پختہ وعدہ کر رہا ہوں کہ بہت جلد صرف تمہارے لئے فیملی کے ساتھ لکھنؤ آؤں گا اور ہوسکا تو چند روز تمہارے ساتھ ہی قیام کر کے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کچھ اپنی کچھ تمہاری سنوں سناؤں گا۔اس مرتبہ قمر کے نوئیڈا واپس جانے کے بعد فونوں اور میسیجوں کی رفتار اور بھی بڑھ گئی۔شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو کہ کسی نہ کسی ذریعہ سے ہم ایک دوسرے سے حال احوال نہ دریافت کر لیتے ہوں۔پھر اچانک کچھ یوں ہوا کہ میرے کئی مرتبہ فون کرنے پر فون نہیں اٹھا نہ ہی کسی میسیج کا جواب ملا۔کئی دن گذر گئے، میں نے بے چین ہو کر ایک تفصیلی میسیج کر کے اس ''بے رخی'' کی وجہ دریافت کی تو جواب میں ان کے بیٹے نبیل نے فون پر یہ اندوہناک اطلاع دی کہ والد صاحب تو ''کورونا'' کی زد میں آکر کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل ہیں۔آپ ان کے لئے خصوصی دعا کیجئے حالت اچھی نہیں ہے۔

میں نے نبیل سے اصرار کے ساتھ کہا کہ مجھے قمر کی رفتار صحت کے

بارے میں بتاتے رہنا۔ میں ان کے بارے میں یہ خبر سن کر بہت بے چین
ہو گیا ہوں۔ ان کی طبیعت میں کچھ سدھار آنے پر جب بیٹے نبیل نے ان کو
میرے میسیج اور فون پر ہوئی گفتگو کے بارے میں بتایا تو قمر نے اپنے بیٹے کو
تاکید کی کہ ہاں عبدالعلی واقعی فکرمند ہوگا، اس کو میری خیریت بتاتے رہنا۔
سعادت مند بیٹے نے باپ کے حکم وفرمائش کی اس طرح تعمیل کی کہ روزانہ
دن بھر کی رفتار صحت کی اطلاع مجھے رات میں میسیج کے ذریعہ تفصیلی طور پر دیتا
رہا۔ قمر کی صحت میں بہ تدریج سدھار آرہا تھا حتیٰ کہ ایک دن بیٹے نے اطلاع
دی کہ امید ہے کہ کل تک والد صاحب کی ہسپتال سے چھٹی ہو جائے گی۔
یہاں تک کی اطلاع کے بعد نبیل کا اگلے دن اور اس کے بعد بھی کئی دنوں تک
کوئی میسیج یا فون نہیں آیا۔

یہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی بات ہے، کچھ شب قدر کی تلاش
کی وجہ سے اور کچھ اس اطمینان کی وجہ سے کہ نبیل سلّمہ کی اطلاع کے مطابق
قمر صحت یاب ہو کر ہسپتال سے اپنے گھر آ گئے ہوں گے، میں نے بھی اپنی
طرف سے کوئی رابطہ نہیں کیا —— پھر اچانک ایک شب قدر کو نماز فجر کی
ادائیگی کے بعد مسجد سے واپس آنے پر فون کے ذریعہ یہ غیر متوقع اور
اندوہناک خبر ملی کہ اسی گذشتہ مبارک شب میں قمر راہی ملک بقا ہو گئے۔ اِنَّا
لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اول وہلہ میں جیسے یقین نہ آیا، مگر فون پر ان کے
اعزہ سے تصدیق ہو جانے پر یقین کرتے ہی بنی —— گویا میرا پیارا
دوست یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ؎

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

کئی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ زندگی کا سفر جاری ہے اور نہیں معلوم کہ
آخری پڑاؤ تک پہنچنے کے لئے یہ سفر ابھی کتنی دور تک اور کتنی دیر تک جاری
رہے گا؟ دنیا کی زندگی کا یہ سفر ایک امتحانی مرحلہ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق
العباد دونوں کی کما حقہ ادائیگی کسی بڑے سے بڑے امتحانی مرحلہ سے کیا کم
ہے؟ جتنی لمبی زندگی ہوگی اتنی ہی لمبی جواب دہی بھی ہوگی۔ اس کے باوجود
کیفیت کچھ یہ ہے کہ ؎

ہر قدم مرحلۂ مرگ تمنا ہے مگر
زندگی پھر بھی ترا ساتھ نہ چھوڑا جائے

حقوق اللہ کا معاملہ تو اس لئے آسان ہے کہ اس کا تعلق صرف ایک
ذات سے ہے اور پھر اللہ بڑا رؤف ورحیم بھی ہے۔ مگر حقوق العباد کا معاملہ
بہت سخت ہے۔ نہ جانے کن کن بندوں کی حق تلفی ہوئی ہوگی، پھر بندے اتنی
آسانی کے ساتھ اپنی حق تلفیوں کو نظر انداز بھی نہیں کرتے؟ بس بندوں سے
یہی کہتے ہوئے رخصت ہونا مناسب سمجھتا ہوں کہ ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

☆☆☆

تجربات زندگی

""تجربہ"" ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق نہ کسی علمی برگزیدگی سے ہے، نہ ہی کسی سماجی وخاندانی حیثیت سے ہے، نہ ہی کسی عہدہ ومنصب سے ہے۔ بلکہ یہ ایک سڑک کے مزدور، دردر بھیک مانگنے والے بھکاری، اور رکشہ پولر سے لے کر اعلیٰ منصب دار، علم کے بحر ذخار، اور تدریس وتعلیم، اور احسان و تصوف سے وابستہ ہر مسلم وغیر مسلم، اور لا مذہب کو ہوتا ہے۔

اپنے اپنے انداز کی زندگی جیتے ہوئے جن افراد ومقامات، اور جن جاندار و بے جان چیزوں سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے، اور پھر اس سے جو اچھا یا برا سبق حاصل ہوتا ہے ——— اسی کا نام ""تجربہ"" ہے۔ حالانکہ تجربہ ہر انسان کو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن کم لوگ ہیں جو اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوں؟۔ اور جب وہ اپنے تجربات زندگی، بیان ہی نہیں کرتے، تو ان کے تجربات، ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اور کسی دوسرے کو اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا۔ جب کہ وہ لوگ جو اپنے تجربات زندگی کو کسی بھی انداز میں بیان کر دیتے ہیں، ان کے تجربات سے جو دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے لئے زندگی کے سفر میں آسانی ہوتی ہے۔ اور بے ساختہ

ان کے دلوں سے تجربات زندگی بیان کرنے والے کے لئے دعا نکلتی ہے۔

اسی بنیاد پر میں تجربات زندگی کے بیان کو ""صدقۂ جاریہ"" کے زمرہ میں شمار کرتا ہوں کہ بیان کرنے والا تو ""اپنے تجربات زندگی"" بیان کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، مگر اس کے بیان کردہ ""تجربات"" نہ جانے کتنے لوگوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دلوں سے اپنے ""تجربات زندگی"" بیان کرنے والے کے لئے دعائیں نکلتی رہتی ہیں؟۔

میری رائے بھی ہے اور سفارش بھی کہ جو لوگ ""اپنے تجربات زندگی"" کسی بھی انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہوں، انہیں اپنے، اور مخلوق خدا کے نفع کے لئے ""اپنے تجربات زندگی"" ضرور بیان کر دینا چاہئے۔

خود مجھے بھی ""ایک دوست نما"" بھتیجہ کہلانے والے مولانا ضیاء الحق خیرآبادی کے توجہ دلانے پر اس کا خیال آیا کہ مجھے بھی اپنے ""تجربات زندگی"" ضرور بیان کر دینا چاہئے۔ اس لئے ذیل میں اپنے ""ان خیر خواہ"" کے شکریہ کے ساتھ کچھ یاد رہ جانے والے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر یہ دوہرا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ تحریر کی ""بے رونقی"" کے بجائے نفس مضمون پر جو لوگ توجہ کریں گے۔ انہیں ان شاء اللہ ضرور نفع ہوگا۔ اور ان کے دل سے جو دعائیں نکلیں گی، وہی میری ""اس تحریر کی اجرت"" ہوں گی۔

(۱) منزل پر نگاہ ہو: میرے والد ماجدؒ ایک انتہائی جفاکش، اور ان تھک محنت کرنے والے انسان تھے، انہیں چھوٹے سے لے کر بڑے

تک، کسی بھی کام میں کوئی عار نہیں ہوتا تھا۔ وہ جس مہم کو سر کرنے کا ارادہ کر لیتے تھے، اسے انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسباب و وسائل کی کمی کے باوجود ان کی پایابیوں کی تعداد و مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان کا بہت چہیتا فرزند ہونے کے باوجود ان تک رسائی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں؟

انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ''دارالعلوم فاروقیہ کاکوری'' کی بنیاد ڈال کر، اس کو برگ و بار لاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر لکھنؤ میں ایک عصری تعلیم کی درس گاہ کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔ اور اسے بھی وہ ''سنی انگلش اسکول'' سے ''سنی انٹر کالج'' بنا دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

''ادارہ دارالمبلغین'' کی خدمات، اور پھر اس کے شعبۂ درس نظامی بہ نام ''جامعہ عربیہ خزینۃ العلوم'' کے قیام سے لے کر ''تحریک مدح صحابہؓ'' میں جیل کی سلاخوں سے لے کر پہلے ''جلوس مدح صحابہؓ'' کی قیادت، اور ''فاتح محمود آباد'' بننے تک، ان کی فتوحات کی ایک ناقابل فراموش تاریخ ہے۔

ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ اپنی ان پایابیوں کی ''شاہ کلید'' انہوں نے مجھ سے میرے حوصلوں کو بلند کرنے کے لئے یہ بیان کی کہ

''نگاہ ہمیشہ منزل پر ہونا چاہئے، کہ ہمیں فلاں منزل پر پہنچنا ہے، راہ کی رکاوٹوں اور مشکلات کے بارے میں پیشگی کبھی نہیں سوچنا چاہئے۔ ورنہ مشکلات و رکاوٹوں کا تصور کر کے ہی

ہمت ہار جاؤ گے۔ اور پھر بس سوچتے ہی رہ جاؤ گے، کام کچھ نہ ہوگا۔ نشانہ طے کر کے بس منزل کی طرف چل پڑو، راہ کی مشکلات اور رکاوٹیں خود بہ خود ہٹتی چلی جائیں گی۔ اور ایک دن وہ آکر رہے گا، جب تم اپنی منزل کو پالو گے۔''

جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ''شاہ کلید'' کو اپنانے کی توفیق دی، تب سے میرا معاملہ کچھ یوں ہوتا چلا گیا کہ ؎

مشکلیں ہی مشکلیں ہیں کارواں کے سامنے
ہیچ ہیں لیکن، مرے عزم جواں کے سامنے

آپ کو یقین نہ آئے تو آپ بھی اس ''شاہ کلید'' کو اپنا کر ایک مرتبہ تجربہ کر لیجئے۔

(۲) باپ کی انوکھی محبت: وہ مجھے اور میرے بھائیوں کو سمجھانے کے لئے کہا کرتے تھے کہ دنیا کے ہر طرح کے رشتوں میں صرف اور صرف باپ ہی ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی انوکھی محبت سے مجبور ہو کر اپنے بیٹوں کے لئے یہ چاہتا ہے کہ وہ مجھ سے آگے نکل جائیں — اور ان کو اپنے سے آگے نکلتے دیکھ کر باپ حسد کرنے کے بجائے خوش ہو ہو کر اسے فخریہ طور پر دوسروں کو بتاتا ہے۔ دنیا کے کسی قریب سے قریب تر رشتہ دار یا دوست کے دل میں یہ جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ بھائی، دوست، یا کوئی اور رشتہ ناطہ دار، جو تمہیں آگے بڑھا کر اور کامیابی کی منزلیں طے کرتے دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے۔ اور تمہارا ہر طرح سے تعاون بھی کرتا ہے، جب اس کو یہ احساس ہونے

لگتا ہے کہ ''یہ تو مجھ سے آگے نکلا جارہا ہے؟'' تو وہی تعاون کرنے اور خوش ہونے والا، تمہاری ٹانگیں کھینچ کر تمہیں نیچے لانے کی تدبیریں کرنے لگتا ہے؟ یعنی باپ کے علاوہ دنیا کی کوئی مخلص سے مخلص ہستی بھی کسی کو اپنے سے آگے نکلتے دیکھنا گوارہ نہیں کرتی — جب کہ ہر باپ فطری طور پر یہ خواہش رکھتا ہے کہ میرا بیٹا کم ازکم میرے جیسا تو ہو ہی جائے۔ اور اگر بیٹا، باپ سے آگے نکلنے لگتا ہے، تو باپ کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں ہوتا — یہ وہ ''انوکھی محبت'' ہے، جو فطری طور پر ہر باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لئے ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں خود مجھے اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد ہے کہ محمود آباد ضلع سیتا پور کے سالانہ جلسہ وجلوس میں ہر سال کی طرح اس مرتبہ سفر پر روانگی سے کئی روز قبل جب میں نے اپنے والد صاحب سے کہا کہ ''اس مرتبہ میں بھی جلسہ میں تقریر کروں گا'' (محمود آباد سے والد صاحبؒ کا کیا رشتہ و تعلق تھا، اور وہاں ان کو عزت واحترام کا کیا مقام، اپنی بے مثال خدمات وقربانیوں کی وجہ سے حاصل تھا؟، اس کی تفصیلات دوسرے مقام پر میں تحریر کر چکا ہوں) والد صاحبؒ نے اپنے کم سن بچے کی زبان سے جوں ہی یہ سنا کہ ''میں بھی تقریر کروں گا'' تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے (واضح رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کے بچوں کی عموماً بسم اللہ بھی نہیں ہوا کرتی تھی، تقریر کی ہمت کرنے کا تو سوال ہی کیا؟) والد صاحب نے اپنے قلم سے آسان الفاظ میں میرے لئے ایک مختصر سی تقریر لکھی، پھر اسے مجھے رٹا کر بار بار سنا، اور مجھے اس قابل بنایا کہ میں ایک بڑے مجمع عام میں اسٹیج سے تقریر کرسکوں۔

اللہ اللہ کر کے وہ روز سعید آیا جب میں نے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کو مجمع عام کے سامنے پیش کیا — عوام وخواص، مردوں عورتوں کی طرف سے اس تقریر پر میری جو حوصلہ افزائی ہوئی، اور مجھے جس طرح انعام واکرام سے نوازا گیا (اس میں مجھ سے زیادہ والد صاحبؒ ہی کی محبوبیت کا دخل تھا۔ اور ظاہر ہے کہ میں ان ہی کا کم سن بیٹا تھا) اس پر مجھے تو جو خوشی حاصل ہوئی، اس کا بیان کیوں کر ممکن ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے کہیں زیادہ والد صاحب نازاں وفرحاں تھے۔

اس کا ایک مظاہرہ اس طرح ہوا کہ جب محمود آباد کے سفر سے ہم لوگوں کی واپسی ہوئی تو والدہ مرحومہ پر نظر پڑتے ہی والد صاحبؒ کی زبان سے کچھ اس طرح کے جملے نکلے۔

''تمہیں مبارک ہو، تمہارا بیٹا تو مجھ سے بھی آگے نکل گیا۔ اب محمود آباد میں گھر گھر اسی کا چرچا ہے، اور لوگ مجھے بھول گئے۔''

ظاہر ہے کہ یہ باپ کی اُسی ''انوکھی محبت'' کا کرشمہ تھا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ ع وہ کہاں میں کہاں، میں کہاں وہ کہاں

(۳) شادی بیاہ میں تاریخ نہ بدلو: اللہ کے فضل وکرم سے ہم سات بھائی بہنوں میں چھ کی شادی بیاہ، والد صاحبؒ نے خود اپنے ہاتھوں، اور اپنے حوصلوں کے مطابق انجام دے دی تھیں۔ صرف میرے سب سے چھوٹے بھائی عبد الوحید (ہمارے ان سے پہلے کے بھائی عبد الکریم سے پانچ برس، اور مجھ سے اٹھارہ برس چھوٹا ہونے کی وجہ سے) رہ گئے تھے۔ جن کی

شادی کی انہیں بہت فکر تھی۔ وہ ضعف ونقاہت کے ساتھ متعدد امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے گھر سے باہر بھی نہیں جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عبدالوحید کے فریضہ سے بھی میں سبکدوش ہو جاؤں تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں وہ ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہمارے پھوپھا مولانا رفیق القاسمی صاحب سے بھی کہتے کہ کوئی رشتہ تلاش کرو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ عبدالوحید کا رشتہ ہنسور ضلع فیض آباد (اب امبیڈکر نگر) کے ایک سادات گھرانے میں طے ہو گیا۔ اور والد صاحب نے ۳؍جون ۱۹۹۴ء نکاح کے لئے، اور ۵؍جون ۱۹۹۴ء ولیمہ کے لئے تاریخ مقرر کر کے دعوتی کارڈ چھپوا کر انہیں تقسیم کرادیا۔

اگرچہ والد صاحبؒ کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔ گھر میں مہمانوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔ بارہ بنکی سے میری منجھلی بڑی بہن صاحبہ شادی میں شرکت کے لئے آ چکی تھیں۔ مگر والد صاحبؒ کی روز بروز گرتی ہوئی صحت، اور تشویشناک علالت سے ہم سب ہی لوگ بہت مضطرب و بے چین تھے۔ اور ایک ''ان دیکھا اندیشہ'' سب کے دماغوں میں پرورش پا رہا تھا، مگر کوئی اسے زبان پر لا نہیں رہا تھا۔

اسی دوران جب کہ شادی کی تاریخ قریب آ گئی تھی، ایک دن والد صاحب نے بارہ بنکی والی ہمشیرہ کی موجودگی میں مجھے اپنے قریب بلا کر آہستہ آہستہ ایک ایسی بات کہی جس سے میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں بلک بلک کر رو پڑا۔ والد صاحبؒ نے کہا

''دیکھو بیٹے! اگر شادی کی کوئی تاریخ مقرر ہونے کے بعد، قریب کی تاریخوں میں کسی ایک فریق کے یہاں کوئی حادثہ پیش آ جائے، تو شادی کی تاریخ نہ بدل کر مقررہ تاریخ ہی میں کر دینا چاہئے۔ کیوں کہ تاریخ قریب ہونے کی وجہ سے دونوں طرف کے انتظامات مکمل ہو چکے ہوتے ہیں، مہمان بھی گھروں میں آ چکے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ایک فریق اپنے گھر کے کسی حادثہ کی وجہ سے شادی کی تاریخ بدلتا ہے، تو دوسرا فریق اخلاقاً کچھ کہہ تو نہیں پاتا، لیکن اسے شدید زحمتوں و تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اسے زیر بار ہونا پڑتا ہے۔ زندگی و موت کا مالک اللہ ہے، کسی کی موت سے نہ دنیا کا کوئی کام رکتا ہے، نہ ہی کوئی بڑے سے بڑا غم ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس لئے فریقین کے لئے راحت اسی میں ہوتی ہے کہ سادگی کے ساتھ شادی پہلے کی مقررہ تاریخ میں کر دی جائے۔''

ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح ان کی زبان سے ہمارے لئے وصیت کرا رہا ہے؟ پھر بھی ایک ''ان دیکھے اندیشہ'' نے مجھے اور وہاں موجود ہمشیرہ صاحبہ کو مضطرب ضرور کر دیا تھا —— اور مجھے بلکتا دیکھ کر والد صاحبؒ نے اپنے سینے سے چمٹا کر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''بیٹے یہ کوئی اپنے ہی لئے تھوڑی کہہ رہا ہوں''، تم عالم ہو اور خوب سمجھتے ہو کہ موت و زندگی کا وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے ہوتا ہے، کسی کے کہنے سے اس کی موت

نہیں آجاتی — یہ تو میں نے تمہیں سمجھانے کے لئے کہا، کیوں کہ تم ہی میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔

مگر وہی کہ ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' اس واقعہ کے چند دن بعد ہی ۳۱؍مئی ۱۹۹۴ء کو والد صاحبؒ کو اچانک ۱۰۶؍ڈگری بخار آیا، اور وہ کوما میں چلے گئے۔ معالجین کے مشورہ سے اسی حالت میں ان کو لکھنؤ کے ''سحر نرسنگ ہوم'' میں داخل کرنے کے بعد سب سے پہلے والد صاحبؒ کی ''وصیت'' پر عمل کرتے ہوئے لڑکی والوں سے رابطہ کر کے والد صاحبؒ کے ذریعہ مقررہ تاریخ ۳؍جون ۱۹۹۴ء کو عبدالوحید کا لکھنؤ میں والد صاحبؒ کی وفات سے چند گھنٹے پہلے نکاح کر دیا۔ اور نئی دلہن کے ہمارے گھر آنے کے تھوڑے وقفہ کے بعد ہسپتال میں والد صاحبؒ نے اپنی زندگی کی آخری سانس اس طرح لی کہ میں نے اس وقت تک والد صاحبؒ کے پاس رہنے کی وجہ سے دولہن کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ صد ہزار شکر ہے اس مالک کا، جس نے ہمیں اپنے والد صاحبؒ کی ایک ''مطابق سنت وصیت'' پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس سلسلہ میں لڑکی کے والد، اس کے بڑے بہنوئی، ودیگر افراد خانہ کا تعاون بھی ناقابل فراموش ہے۔ (اس پورے واقعہ کی تفصیلات میں متعدد مقامات پر تحریر کر چکا ہوں)

(۴) میاں بیوی میں پہلے کس کا دنیا سے جانا بہتر ہوتا ہے؟

میرے والد ماجدؒ ایک سراپا حرکت انسان تھے، وہ بہت پھرتیلے تھے، اور جسم وجسامت بھاری بھرکم نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت تیز تیز چلتے

تھے، ان کی آواز بہت بلند تھی، مدرسہ دار المبلغین کے چینل گیٹ کے باہری سیڑھی پر کھڑے ہو کر وہ کبھی مجھے یا کسی اور کو آواز دیتے تو میرے مکان کے باہر گلی سے سڑک پر آنے والے سرے پر کھڑے شخص تک ان کی آواز دن کے شور وغل کے اوقات میں بھی پہنچ جاتی تھی۔ حالانکہ دونوں کے درمیان کچھ بہت زیادہ تو نہیں، مگر اتنا فاصلہ تو ہے ہی کہ میں، یا میرے جیسا کوئی عام انسان وہاں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہت پر جوش وبلند آہنگ خطیب تھے۔ ان کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے نام کا اعلان ہوتے ہی مجمع امنڈ پڑتا تھا۔ یہ وقت تھا جب لاؤڈ اسپیکر کا چلن عام نہ تھا، اور اس کا استعمال بہت بڑے عوامی جلسوں ہی کے لئے ہوتا تھا۔ ان کی تقریریں سننے اور اس پر جھومنے اور رونے والوں نے بتایا کہ کبھی کبھی کوئی خاص موقع آنے پر مولانا صاحب مسلسل چھ چھ گھنٹے تک تقریر کرتے رہتے، اور وقت گزرنے کا نہ انہیں احساس ہوتا، نہ مجمع کو۔ خاص طور پر سیرت النبی و سیرت صحابہؓ پر تقریریں کرتے ہوئے ان پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ بیان کرتے ہوئے خود بھی روتے اور مجمع کو بھی رلاتے رہتے۔ وہ اپنی جسمانی قوت، اور ضعف وامراض کی معذوریوں سے پہلے تک ہمیشہ کھڑے ہو کر تقریریں کرتے تھے۔ اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر مجمع کے آخری سرے تک ان کی آواز پہنچ جایا کرتی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ اس دور کی بات ہے جب وہ پوری طرح توانا وتندرست تھے۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے ان کو مختلف قسم کی بیماریوں میں

مبتلا پایا۔ ۱۹۶۴ء کے شدید قلبی حملہ نے تو ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کے بعد شہر و بیرون شہر ان کی تقریروں کا سلسلہ بس برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ لیکن ۱۹۶۴ء سے پہلے کے دور میں کرسی پر بیٹھ کر ۳-۳ گھنٹے تک کی تقریریں تو میں نے بھی سنی ہیں، جس میں رنگ تو وہی ہوتا تھا، جو پرانے بزرگ لوگ بتایا کرتے تھے، لیکن آہنگ میں وہ بلندی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اپنی آواز پورے مجمع تک پہنچا پاتے۔

فطرت کے اصول ''ہر کمالے را زوالے'' کے مطابق والد صاحبؒ کی جوں جوں عمر بڑھتی گئی، ضعف و امراض کا غلبہ بھی بڑھتا گیا۔ زندگی کے کم وبیش آخر کے پانچ برس تو اس حال میں گذرے کہ گھر کی سیڑھیوں سے اتر کر مکان سے بالکل متصل مسجد تک بھی وہ ہر نماز میں نہیں پہنچ پاتے تھے۔ کبھی ان کے شدید اور ہم لوگوں کو تشویش میں مبتلا کر دینے والے ضعف کے دوران تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ کئی کئی دنوں تک مسجد نہ جا کر اپنے تخت ہی پر بیٹھے بیٹھے جیسے تیسے کچھ طبیعت بحال ہونے پر نمازیں ادا کر لیا کرتے تھے، اور ہم لوگ دعائیں کرتے کہ اللہ کرے کہ میرے ابو اس قابل ہو جائیں کہ مسجد جا کر نمازیں ادا کریں۔ اور پھر جب اللہ کی رحمت سے ایسا ہوتا کہ وہ مسجد جانے لگتے تو ہم لوگ اطمینان کی سانس لے کر آپس میں کہتے کہ ماشاء اللہ ابو کی طبیعت ٹھیک ہے۔ ان پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، اور اس کا سلسلہ بسا اوقات کئی کئی گھنٹے تک رہتا۔ چوں کہ وہ اس دوران ہوش و حواس میں رہتے، مگر اپنی اندرونی کیفیت کی وجہ سے کسی سے بات نہیں کر پاتے

تھے۔ اس میں کبھی کبھی بلند آواز میں کلمہ طیبہ، کبھی درود شریف، اور کبھی کبھی اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْنَا قَبْلَ الْمَوْتِ...... وَھَوِّنْ عَلَیْنَا سَکَرَاتِ الْمَوْتِ کا ورد کرتے۔ بے چینی زیادہ بڑھتی تو لیٹے سے بیٹھ جاتے، کچھ جمائیاں اور ڈکاریں آجاتیں تو طبیعت آہستہ آہستہ بحال ہو جاتی۔

ایک دن ان پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی، اور قریب میں بیٹھی والدہ صاحبہ، ان کی پیٹھ اور پیٹ پر آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف اپنے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ہم بھائی بہن بھی ارد گرد بیٹھے مصروف دعا تھے کہ اچانک انہوں نے والدہ صاحبہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بس اب بہت ہو چکا ع

پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

تم لوگ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ قبر کی اور حشر کی منزلیں آسان کر دے۔

ان کی زبان سے اس طرح کی باتیں سن کر ہماری آنکھیں بھی نم ناک ہو گئیں۔ اور والدہ صاحبہؒ کے تو ضبط کے بندھن ہی ٹوٹ گئے۔ انہوں نے پھپھکتے ہوئے والد صاحب کو مخاطب کر کے کہا، اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں سے میری مٹی سوارت کرے، اور ہمیں وہ دن نہ دیکھنا پڑے کہ آپ کے بغیر ہم اس دنیا میں رہیں۔

اس وقت تو والد صاحبؒ اس حال میں نہ تھے کہ والدہ صاحبہ کو کچھ جواب دیتے، کئی گھنٹوں کے بعد طبیعت بحال ہونے پر، یا پھر دوسرے دن بڑے اہتمام کے ساتھ مجھ کو اور میری سب سے بڑی بہن مرحومہ کو اپنے پاس بٹھا کر والدہ صاحبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے ان سے سوال کیا کہ، تم اس

وقت جب میری طبیعت بگڑ رہی تھی، کیا کہہ رہی تھیں؟ یہ کہ میں زندہ رہ جاؤں، اور میرے سامنے ہی تمہاری موت ہوجائے؟

والدہ صاحبہؒ نے جواب میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا، ہر عورت کی خوش نصیبی اسی میں ہے کہ اسے بیوگی کے دن نہ دیکھنا پڑیں، اور شوہر کے کاندھوں پر اس کا جنازہ اٹھ جائے۔

یہ سن کر والد صاحبؒ نے بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ ایک عجیب بات کہی کہ، دیکھو آئندہ کبھی یہ دعا نہ کرنا۔ بڑھاپے کی عمر میں اگر پہلے بیوی مرجاتی ہے تو شوہر کے لئے زندگی کے دن کاٹنا دوبھر ہوجاتا ہے۔ بیٹیاں اپنے گھروں کی ہوجاتی ہیں، بہوؤں کے اندر نہ خدمت کا وہ جذبہ ہوتا ہے نہ ہی ان سے لحاظ کی وجہ سے بے حجابانہ اپنی ضروریات کے لئے کہا جاسکتا ہے۔ اور پھر جب بڑھاپے میں زحمتوں کا سامنا ہوتا ہے تو قدم قدم پر اپنی مرحومہ بیوی کی یاد مزید بے چین کرتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر شوہر کی پہلے وفات ہوجائے تو بیوگی کا صدمہ اپنی جگہ، مگر عموماً دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ لاپرواہ لڑکے، لڑکیاں، اور بہویں بھی قابل رحم اور غم سے دوچار بیوہ کی ہر طرح دل جوئی میں لگ جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں بسا اوقات بیوہ کی زندگی اپنے شوہر کے دور سے زیادہ اطمینان بخش اور پرسکون ہوجاتی ہے۔ اور شوہر کی وفات کا صدمہ بھی ہلکا ہوجاتا ہے؟

خود میرے اپنے گھر میں یہی ہوا کہ والد صاحبؒ کی پہلے وفات ہوگئی، اور ان کی وفات کے بعد بیس برس تک والدہ صاحبہؒ زندہ رہیں۔ وہ میرے

گھر میں رہتی تھیں۔ جو کچھ ہم لوگوں سے بن پایا وہ تو اپنے لئے ذخیرۂ آخرت سمجھ کر کیا، میری بہنیں (جو دو بہنیں قریب ہی کے مکان میں رہتی تھیں) اور میرے تینوں بھائی و بھاوجیں ان کے کھانے پینے، کپڑوں لتوں سے لے کر دوا علاج کے سلسلہ میں اس طرح سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے کہ بسا اوقات ضرورت سے اتنی زائد اشیاء ہوجاتیں کہ والدہ صاحبہؒ کو باصرار منع کرنا پڑتا۔ اس توجہ و راحت رسانی کی کوشش سے انہیں جو سکون واطمینان ملتا وہ تو تھا ہی، ہم سب کو ان کے دل سے نکلی ہوئی ایسی ایسی دعائیں ملتیں کہ بس کیا عرض کیا جائے؟ ہم سب اپنے رب کی رحمت سے امیدوار ہیں کہ اپنی تمام تر نالائقیوں کے باوجود والدہ مرحومہ کی دعائیں ضرور ہمارے کام آئیں گی۔ والدہ صاحبہؒ میرے گھر کے جس کمرہ میں رہتی تھیں، مغرب اور عشاء کے بعد وہ کمرہ روزانہ ان کی بیٹیوں، بہوؤں، اور بیٹوں سے بھر جاتا، ہم آپس میں ایک دوسرے سے بھی روزانہ ملتے، کھاتے پیتے، اور والدہ صاحبہؒ کی دل جوئی کا سامان بھی ہوجاتا۔

والدہ صاحبہؒ کے انتقال کے فوراً بعد جب ہم سب جمع ہوئے تو سب کی موجودگی میں باحسرت و یاس میں نے کہا کہ امّی کے ساتھ میرے گھر کی ساری نعمتیں بھی چلی گئیں۔ اب کہاں ان کے طفیل میں سب کا اس طرح روزانہ ساتھ ہوگا؟ میرے اندر تو ایسی کوئی کشش نہیں ہے کہ تم سب لوگ اس طرح میرے لئے جمع ہو؟ وعدے وعید تو خوب ہوئے۔ مگر نتیجہ وہی سامنے آیا کہ ایک بلڈنگ میں چاروں بھائیوں، اور قریب ہی کے مکان میں بہنوں اور ان

کے کنبوں کے رہنے کے باوجود بسا اوقات کئی کئی دنوں تک ملاقات بھی نہیں ہو پاتی۔ کہنا پڑتا ہے کہ والد ماجدؒ نے ''اپنے تجربات زندگی'' کی روشنی میں جو کچھ کہا تھا، وہ حرف حرف صادق ہو کر رہا۔ جس کا تجربہ ہم لوگ بھی کر رہے ہیں۔

(۵) اپنی شناخت نہ چھپاؤ: ایک بات میں اپنے تمام خردوں، خصوصاً اپنے شاگردوں و اولاد سے بہت زور دے کر کہتا ہوں کہ ''اپنی شناخت کو کبھی نہ چھپاؤ'' ورنہ سخت زحمتوں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا، اور ''منافقت کی زندگی''، تمہیں بے وزن و بے اعتبار بھی کر دے گی۔ مثال کے طور پر اگر تم مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ایک طالب علم ہو تو تمہیں اس بات پر فخر ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تعلیم کے لئے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ ورنہ یہ نعمت اور مواقع ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتے؟ اس لئے اپنی وضع قطع، نشست و برخاست، ہر چیز سے فخریہ طور پر اس کا اظہار کرو کہ بفضلہ تعالیٰ ہم ایک دینی مدرسہ کے طالب علم ہیں — یہ نہیں کہ تم اپنے آپ کو ''ایک بے چارہ دینی مدرسہ کا طالب علم'' سمجھ کر اپنی شناخت کو چھپانے کے لئے سر پر بڑے بڑے انگریزی طرز کے بال رکھو، مدرسہ کی چہار دیواری اور نگرانوں کی پہنچ سے باہر نکلتے ہی سر سے ٹوپی اتار کر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگو، کسی کے پوچھنے پر اپنے کو ''طالبعلم'' کہنے کے بجائے اسٹوڈنٹ بتاؤ۔ اپنے دینی مدرسہ کو اسکول، یا کالج کے نام سے متعارف کراؤ، اور ''موقع ملنے پر ارمان نکالنے کے لئے'' پائجامہ کے نیچے لوور پہنے رہو۔

اس قسم کے جذبات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی لڑکا اپنی موجودہ زندگی، اور موجودہ تعلیم سے مطمئن نہ ہو کر ''احساس کمتری'' میں مبتلا ہو۔ اور اپنے مقابلہ میں دوسری قسم کے اسی طرز کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو اپنے سے فائق و ممتاز سمجھتا ہو گا؟

نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ایک شکستہ اور نا آسودہ زندگی بسر کر رہے ہو گے — اور جب تم خود ہی اپنے آپ کو اپنے سماج کا کمتر و محروم انسان سمجھ رہے ہو گے تو تمہارے اندر نہ کچھ بننے اور بڑھنے کا حوصلہ رہے گا، نہ ہی دوسرے لوگ تمہیں ''خیرات میں'' عزت دیں گے۔ وہ تمہیں ملّا جی، مولوی صاحب، اور حافظ جی کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے اپنے کو برتر اور تم کو کمتر ہی سمجھیں گے۔ اور تم ''بے چارے'' اپنی اس حیثیت کو قبول کرنے پر مجبور ہو گے؟

تم ایک بجھتے چراغ کی طرح زندگی کا بوجھ ڈھو رہے ہو گے، تمہاری اڑان کسی مسجد کی امامت یا مؤذن، گھر گھر جا کر ٹیوشن پڑھانے، یا پھر کسی مکتب میں پڑھانے سے آگے کی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر ''خوش قسمتی سے'' کسی بڑے دینی مدرسہ میں پڑھانے کا موقع مل جائے تو تم اسے اپنی زندگی کی معراج سمجھو گے؟ حالانکہ اگر تمہارے ہی گھر کا تمہارا کوئی حقیقی بھائی عصری تعلیم کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہوگا، اور وہ واقعی اپنی تعلیم میں امتیاز حاصل کر رہا ہو گا تو اس کی اڑان آئی-اے-ایس، اور آئی-پی-ایس، یا کم سے کم ایم-بی-بی-ایس ڈاکٹر یا انجینئر بننے کی ہوگی۔ اور وہ ''اپنی شناخت'' کو فخریہ طور پر ظاہر کر رہا ہوگا۔ وہ اگر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہو گا تو اپنا

کالج والا ڈریس ''سفید اپرن'' پہلے ہی سال سے پہن کر سڑکوں، پارکوں، بازاروں، اور ہوٹلوں میں اس لئے جائے گا کہ اسے دور سے دیکھ کر ہی لوگ سمجھ لیں کہ یہ لڑکا ڈاکٹر بن رہا ہے؟ قانون فطرت یہ ہے کہ حوصلے کے مطابق ہی پرواز ہوتی ہے۔ جب تم پہلے ہی دن سے اپنے آپ کو ''بے چارہ مدرسہ کا طالب علم'' قرار دے دوگے تو یہ ''بے چارگی'' زندگی بھر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ خلاصہ یہ کہ تم جو ہو، وہی ظاہر کرو۔ یاد رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنی اولاد کو وصیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ (اللہ نے تمہارے لئے اپنے دین کو چنا ہے) یعنی دین، اس کی تعلیم و تعلّم، اور اس راہ میں بسر ہونے والی زندگی، ہر ایک کو نہیں ملتی، اس کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اور اس کے منتخب بندے ہی اس راہ پر گامزن ہو پاتے ہیں — جب کہ دوسری ہر قسم کی تعلیم وطرز حیات کے لئے ایسی کوئی قید نہیں ہے، اور اسے بلا استثنا، ہر ایک حاصل کر سکتا ہے۔ ''حتیٰ کہ اس کے لئے مسلمان ہونے کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔'' یعنی جب تمہارا حوصلہ بلند ہوگا تو کامیابیاں تمہارے قدم چومیں گی۔ اور حوصلہ ہی پست ہوگا، تو پستی ہی تمہارا مقدر ہوگی۔ بلند حوصلہ کے ساتھ تم جس حال اور جس لباس میں بھی رہو گے، خوش اور آسودہ رہو گے۔ کیوں کہ ؎

''خودی'' قائم رہے تو فخر سلطانی ہے درویشی
فقط ''احساس کی پستی'' سے گھٹتا ہے وقار اپنا

(۶) — نماز جگہ دلواتی اور عزت بڑھاتی ہے: عموماً ہمارے مدارس کے طلبہ مدارس کے ماحول اور نگرانی کی وجہ سے دینی تقاضوں کی پابندی کرتے ہیں۔ نماز وروزہ، ودیگر دینی امور کی پابندی کرتے ہوئے باجماعت نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض باتوفیق طلبہ تو تہجد گذار بھی ہوتے ہیں، نفل روزوں خصوصاً محرم کے روزوں اور ۱۵؍شعبان کے روزہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ کبھی ایسے طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو مدرسہ کی طرف سے ان کے لئے افطار وسحری کا بھی انتظام کیا جاتا ہے — تاہم یہ خوبیاں مدرسہ کے ماحول کے زیر اثر ہی ہوتی ہیں اور اکثریت ایسے طلبہ کی ہوتی ہے جو اپنے گھروں کو جاتے ہوئے سفر میں نمازوں کا بھی اہتمام نہیں کرتے۔ میں اکثر اپنے زیر درس طلبہ سے کہتا ہوں کہ بھائی تم لوگ حدیث وفقہ کی کتابوں سے ''باب صلوٰۃ المسافر'' کو نکلوا دو۔ کیوں کہ اس میں بیان کردہ مسائل کی ضرورت تو ان ہی مسافروں کو پیش آتی ہے جو حالت سفر میں بھی نمازوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جب تم لوگوں کو سفر میں نمازیں پڑھنا ہی نہیں ہوتیں تو تمہیں مسافر کی نماز کے مسائل کی کیا ضرورت؟

کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ایک جلسہ میں شرکت کے لئے عین اس دن جس دن سالانہ تعطیل کلاں ہوئی، مجھے بہار کے طلبہ کی ''پسندیدہ ٹرین'' لکھنؤ بَرونی ایکسپریس سے گونڈہ کا سفر کرنا پڑا۔ چوں کہ لکھنؤ کے تمام چھوٹے بڑے مدارس میں اسی دن تعطیل ہوئی تھی، اس لئے سفر کرنے والے طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ٹرین میں بیٹھنے تو کیا، صحیح طریقہ پر کھڑے ہونے کی بھی

جگہ نہ تھی۔ طلبہ کے اس ہجوم میں مجھے اپنے مدرسہ کے کچھ طلبہ بھی نظر آئے۔ لکھنؤ سٹی اسٹیشن سے ہمیں اپنے ایک رفیق سفر کے ساتھ گونڈہ تک سفر کرنا تھا۔ ٹرین کی اس اسٹیشن سے روانگی اور گونڈہ پہنچنے کا وقت کچھ ایسا تھا کہ نماز عصر تو یقینی طور پر، اور اگر ٹرین کچھ لیٹ ہوگئی تو نماز مغرب بھی ٹرین ہی میں ادا کرنی تھی، جس کے لئے ہم دونوں وضو اور سفری مصلّٰی کے ساتھ تیار تھے۔ چنانچہ ٹرین کی لکھنؤ سے روانگی کے بعد عصر کی نماز کا وقت آنے پر ہم نے نماز کی ادائیگی کے لئے وہاں موجود طلبہ سے اِدھر اُدھر ہوکر مصلّٰی بچھانے کی جگہ کے لئے اشارہ کیا، جسے طلبہ نے پوری بشاشت وخندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے ہماری نماز کے لئے اچھی خاصی جگہ بنادی۔ ہمیں طلبہ کی موجودگی سے یہ اطمینان تھا کہ باجماعت نماز ہوگی۔ اسی لئے میں نے بآواز بلند یہ اعلان کردیا کہ تھوڑے تھوڑے لوگ کرکے نماز ادا کریں، سب ایک ساتھ باجماعت نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ جن طلبہ کے پاس پاک چادر ہو، وہ اسے بچھالیں، اور امام کے لئے مصلّٰی میرے پاس موجود ہی ہے۔ یہ کہہ کر میں امامت کے لئے مصلّٰی پر کھڑے ہوکر کچھ دیر طلبہ کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جب کوئی نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ ان کا نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے، کیوں کہ انہوں نے فرضی طور پر اپنے لئے یہ ''قاعدہ کلیہ گڑھ لیا ہے کہ یَجُوْزُ لِلطَّلَبَةِ مَالَا یَجُوْزُ لِغَیْرِھِمْ ''، (طلبہ کے لئے وہ سب کچھ جائز ہے جو طلبہ کے علاوہ دوسرے کسی کے لئے جائز نہیں ہے) چنانچہ مایوس ہوکر میں نے نگاہ دوڑائی تو اپنے مدرسہ کا ایک طالب علم ایک کونے میں دبکا ہوا نظر آگیا، جسے میں نے ڈانٹتے ہوئے

آواز دے کر کہا چلو جلدی سے ٹرین کے پانی سے وضو کرکے میرے ساتھ باجماعت نماز پڑھو۔ اب وہ بے چارہ کیا کرتا، ''مجبوراً'' اس نے وضو کرکے ہمارے ساتھ باجماعت عصر کی دو رکعتیں ادا کیں۔ جب کہ اس کے دوسرے ساتھی طلبہ اس کی ''قابل رحم'' حالت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔

اس ایک اتفاقی واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عموماً ہمارے طلبہ اپنے اپنے مدرسوں میں رہتے ہوئے جس طرح نمازوں کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح مدرسوں سے نکلنے کے بعد حالت سفر میں نمازیں نہ ادا کرنے کا بھی اہتمام کرتے ہیں؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

عموماً ہمارے یہ طلبہ، اور ان کے علاوہ دیگر نمازوں کے پابند حضرات بھی ٹرینوں میں بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے نمازیں ادا کرنے کے لئے جگہ نہ مل پانے کا عذر کرتے ہیں۔ حالاں کہ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ نماز کا نام سنتے ہی لوگ خوشی خوشی جگہ بنادیتے ہیں — اور ایسا صرف مسلم ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے کچھ بڑھ کر غیر مسلم حضرات بھی اپنی نشستیں چھوڑ کر نماز کے لئے جگہ بنادیتے ہیں۔ اور نماز کا ان پر ایسا رعب پڑتا ہے کہ نہ صرف وہ نماز پڑھنے والے کے لئے جگہ بنادیتے ہیں، بلکہ نماز ادا کرنے کے بعد نمازی کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا کر اسے باصرار اپنے ساتھ سیٹ پر بھی بٹھا لیتے ہیں۔

بنارس کے ایک سفر میں اپنے ساتھ پیش آیا ہوا ایک واقعہ تو مجھے بہ خوبی یاد ہے، جب میں لکھنؤ سے بنارس کے لئے ''پنجاب میل ٹرین'' سے سفر کررہا تھا۔ امرتسر سے ہوڑہ تک چلنے والی اس ٹرین سے سفر کرنے والے اچھی طرح

جانتے ہیں کہ اس ٹرین میں ہمیشہ کیسی بھیڑ رہتی ہے؟ اور عالم یہ ہوتا ہے کہ بغیر ریزرویشن کے جنرل کلاس کے مسافروں کو پیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں مل پاتی ہے۔ چوں کہ میرا یہ سفر بھی اچانک اس طرح ہوا تھا کہ میں ریزرویشن نہ کرا کے جنرل کلاس میں لکھنؤ سے بنارس کا سفر کرنے کے لئے مجبور تھا۔ اتفاق سے ان دنوں اس ٹرین کی لکھنؤ سے روانگی اور بنارس پہنچنے کا ایسا وقت تھا کہ نماز ظہر ٹرین ہی میں ادا کی جاسکتی تھی۔ یہ سفر تنہا ہی کرنے کے لئے ۱۲؍بجے دن سے کچھ پہلے ٹرین آنے پر کسی نہ کسی طرح دھکا مکی کر کے ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں پہنچ تو گیا، مگر رائے بریلی تک مجھے ایک پیر پر کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ ۲؍بجے کے لگ بھگ جب رائے بریلی سے ٹرین روانہ ہوئی تو بہ مشکل تمام میں نے اپنے بیگ سے مصلیٰ نکال کر دو انگلیوں کے اشارہ سے اغل بغل کے لوگوں سے نماز کی ادائیگی کے واسطے ۲؍منٹ کے لئے جگہ بنانے کی درخواست کی۔ اتفاق یہ کہ میرے آس پاس کے مسافروں میں کوئی ''مسلم چہرہ والا'' نہ تھا، بلکہ کچھ لوگوں کا اپنی ہیئت سے غیر مسلم ہونا بالکل ظاہر تھا۔ اس کے باوجود سب نے بڑی بشاشت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مجھے نماز کے لئے جگہ دے دی کہ ''مولوی صاحب! آپ اطمینان سے اپنی نماز پڑھیں، کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم بھی دھارمک لوگ ہیں، سب کا مالک ایک ہے، بس پوجا کا اپنا اپنا طریقہ ہے؟؟۔

اسی دوران جب وہ کھڑے ہوئے لوگ ادھر ادھر ہوئے تو سامنے سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نظر آئے۔ جو چار سیٹوں والی برتھ پر ۶-۶، ۷-۷

کی تعداد میں کسی طرح ایک دوسرے کے بیچ میں آگے پیچھے ہو کر پھنسے ہوئے تھے۔ میں نے ان ہی کی دو برتھوں کے بیچ میں مصلیٰ بچھا کر دو رکعت نماز ظہر ادا کی۔ جب میں نماز سے فارغ ہو کر اپنا مصلیٰ سمیٹ رہا تھا تو یہ حیرت ناک منظر سامنے آیا کہ دونوں طرف کی برتھوں سے کئی کئی لوگ کھڑے ہو کر مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میری جگہ پر آپ بیٹھ جائیے۔ آپ بھگوان کے قریبی بندے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ تو کھڑے ہو کر جائیں اور ہم بیٹھے رہیں۔

ان کی اس والہانہ پیش کش کو تو میں نے قبول نہیں کیا، مگر ان کے اصرار پر ان ہی کے ساتھ مجھے بھی اس طرح بیٹھنا پڑا کہ میں تو آرام سے بیٹھا ہوا تھا، اور اغل بغل والے بس ٹنگے ہوئے تھے، تاہم وہ مطمئن تھے۔

رائے بریلی سے بنارس تک کئی گھنٹے کے سفر کے دوران میری اپنے پڑوسیوں سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ پرتاپ گڑھ اسٹیشن آنے پر ایک نے سموسے اور دوسرے نے چائے خرید کر مجھے باصرار کھلایا پلایا۔ اور بہت ہی اطمینان واعزاز کے ساتھ میرا بنارس تک کا یہ سفر پورا ہوا۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ میری اس دو رکعت نماز کی برکت سے ہوا؟—— اسی لئے میں اپنے طلبہ اور خردوں سے کہتا ہوں کہ ٹرین میں نماز نہ ادا کرنے کے لئے جگہ نہ ہونے کا بہانہ نہ کرو۔ نماز تو جگہ بھی دلواتی ہے اور عزت بھی بڑھاتی ہے—— یہ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے، جسے میں فراموش نہیں کر سکتا ہوں۔

تجربے اور بھی ہیں —— مگر مولانا ضیاء الحق صاحب کی فرمائش پوری کرنے کے لئے فوری طور سے ان ہی کے بیان پر اکتفا کر رہا ہوں۔

کیا یاد رہا؟ —— ایک مثال

میری عمر یہی کوئی ٦-٧ برس کی رہی ہوگی۔ ایک دن میں گھر میں تھا کہ اچانک باہر سے والد صاحبؒ گھبرائے گھبرائے سے آئے، اور میرا ہاتھ پکڑ کر والدہ صاحبہؒ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسے کپڑے بدلوا کر مدرسہ (دار المبلغین کی قدیم عمارت جو میرے مکان سے ملی ہوئی تھی) بھیج دو —— حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ صاحب آ رہے ہیں۔ ان سے اس پر دم کرا لوں گا —— اتنا کہہ کر والد صاحب جس تیزی کے ساتھ آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔

والدہ صاحبہؒ نے مجھے دھلے ہوئے کپڑے پہنا کر فوراً ہی بھیج دیا۔

میں مدرسہ پہنچا تو ڈیوڑھی ہی میں والد صاحب مل گئے، اور انہوں نے میرا بازو تھام کر اس ہدایت کے ساتھ اسی جگہ ایک کنارہ پر کھڑا کر دیا کہ یہیں کھڑے رہنا۔ ابھی حضرت یہیں آئیں گے۔ ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر بالا خانہ کا زینہ تھا، جہاں جد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبد الشکور صاحبؒ کی سکونت تھی۔ جن سے ملاقات ہی کے لئے حضرت مدنیؒ تشریف لائے تھے۔

میرے اغل بغل، آمنے سامنے اور بھی کچھ لوگ حضرت سے مصافحہ کے اشتیاق میں کھڑے تھے۔ اچانک کچھ ہلچل سی ہوئی، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا سامنے سے ایک طویل القامت، اونچی پیشانی، اور منور چہرہ کی حامل شخصیت کو اپنی سمت میں آتے ہوئے دیکھا، جن کی بغل میں داہنی طرف دادا صاحب اور پیچھے پیچھے والد صاحب اور کچھ دیگر لوگ چل رہے تھے۔ حضرت مدنیؒ میرے قریب آئے تو والد صاحبؒ نے مجھے بازو سے پکڑ کر ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا: ”حضرت! یہ خادم زادہ ہے، اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے“۔

حضرت نے وہیں ٹھہر کر اپنا سر اونچا کر کے والد صاحبؒ سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجہ میں بآواز بلند فرمایا ”جی، خادم زادہ کہ مخدوم زادہ؟ اور پھر اپنا داہنا ہاتھ میرے سر پر اور بایاں ہاتھ سینہ پر رکھ کر کچھ پڑھ کر دم کیا، اور یہ دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے ”اللہ تعالیٰ عمر میں اور علم و عمل میں برکت عطا فرمائے، اور اپنے دین کے لئے قبول فرمائے“۔

حضرتؒ کی یہی بس ایک جھلک کی زیارت، اور براہ راست اپنے حق میں دعائیہ کلمات کی ساعت تھی جو اول بھی تھی اور آخر بھی۔

ساٹھ برس سے زیادہ کا طویل عرصہ گذر گیا —— مگر حضرت مدنیؒ کا وہ اجلا اجلا نورانی چہرہ، ان کی آنکھوں پر لگے ہوئے چشمہ کا فریم، ان کا باوقار انداز رفتار، ان کا ٹھہر کر بہ آہنگ دل نشین، دعائیں دینا، سر اور سینہ پر ہاتھوں

کو رکھ کر دم کرنا، یہ پورا منظر نگاہوں کے اس طرح سامنے ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو؟۔

اللہ گواہ ہے کہ متعدد کامرانیوں وکامیابیوں کے مواقع پر حضرت مدنیؒ اور ان کی دی ہوئی دعا یاد آئی، اور ہر مرتبہ دماغ کی سرگوشی پر دل کو یقین آیا کہ اللہ کے مقرب بندوں کو تو اپنے رب کے سہارے مٹی کو سونا بنانے کا کیمیا آتا ہی ہے؟

بس ایک جھلک کی بات! ساٹھ برس سے زائد کا طویل عرصہ، اور ایک ایک جزئی تفصیل کا یاد رہ جانا— میرے حافظہ کا کمال نہیں، صرف اور صرف میرے رب کے کرم کا معاملہ ہے۔

وہ جب نوازنے پر آتا ہے تو کیڑے مکوڑوں کو بھی قیمتی بنا کر محفوظ کرنے اور سجا کر رکھنے کا سامان کر دیتا ہے۔

کیا بھول گیا؟— ایک مثال: اور یہ ابھی ۵-۷ برس پہلے ہی کی بات ہے کہ کرلا، ممبئی کے ایک اصلاحی ودینی جلسہ میں شرکت کی غرض سے چند گھنٹوں کے لئے ممبئی کا سفر ہوا۔

یوں تو عدالت عالیہ کا یہ حکم کہ صوتی آلودگی سے تحفظ کے لئے دس بجے رات کے بعد لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کا استعمال نہ کیا جائے، پورے ملک کے لئے ہے، مگر جس سختی کے ساتھ ممبئی میں اس پر عمل درآمد ہوتا ہے، کسی دوسرے مقام پر دیکھنے کو نہیں ملا۔ اسی لئے اب ممبئی میں جلسے عموماً بعد نماز مغرب سے

دس بجے شب تک ہی ہوتے ہیں، اور عشاء کی نماز اس دن جلسہ ختم ہونے کے بعد تاخیر سے ہوتی ہے۔

اسی نظام کی رعایت میں لکھنؤ سے ۲/بجے دن میں روانہ ہوکر ساڑھے ۴/اور ۵ بجے کے درمیان ممبئی پہنچا۔ ایئر پورٹ پر کچھ احباب استقبال کے لئے موجود ملے، جو فوراً ہی مجھے اپنے ہم راہ لے کر کرلا کے لئے روانہ ہوگئے۔ راستہ میں انہوں نے اپنی مرکز والی مسجد کے امام صاحب کے بارے میں بتایا کہ وہ آپ کا بہت والہانہ انداز میں ذکر خیر کرتے ہیں۔ اور آج آپ کی یہاں آمد سے بہت خوش، اور ملاقات کے لئے سراپا اشتیاق ہیں۔

جلسہ گاہ سے متصل ہی ایک مکان میں مجھے پہنچایا گیا، جہاں میں نے نماز عصر بالقصر ادا کی۔ اور ابھی وہاں موجود احباب سے کچھ ابتدائی ورسمی گفتگو میں مشغول ہوا ہی تھا کہ سامنے دروازہ پر نظر پڑی کہ طویل القامت، گھنی داڑھی اور شرعی لباس میں آراستہ ادھیڑ عمر کے ”کوئی بزرگ“ آرہے ہیں، جن کے پیچھے پیچھے ۸-۱۰ لوگ عقیدت مندانہ انداز میں چل رہے ہیں۔ میری چھٹی حس نے فیصلہ کیا کہ یہی وہ امام صاحب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی بارعب شخصیت کا احترام کرتے ہوئے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا۔ اور انہوں نے مصافحہ پر اکتفا نہ کرتے ہوئے معانقہ بھی کیا۔ میرے اصرار کے باوجود انہوں نے بیڈ کے سرہانے خود نہ بیٹھ کر مجھے ہی بٹھایا۔ کچھ دیر کی پر تکلف اور جی جناب والی گفتگو سے انہوں نے میرے حافظہ کی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے سوال کر ہی لیا کہ حضرت آپ نے مجھے پہچانا

نہیں؟ اس سوال پر میں ایک مرتبہ پھر اسی طرح جھینپ گیا جیسا پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔ میں نے تاویلات فاسدہ کا سہارا لیتے ہوئے اسی طرح کے الفاظ بول کر اپنی کمزوری کا اظہار کیا جیسا کرتا رہا ہوں۔ یعنی شکل تو کچھ پہچانی پہچانی لگ رہی ہے، نام نہیں یاد آرہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جواب میں انہوں نے یہ ناقابل تصور انکشاف کیا کہ میں تو آپ کا فلاں نام کا شاگرد ہوں۔ دارالعلوم فاروقیہ کاکوری میں چھ برس تک رہ کر میں نے تعلیم حاصل کی، اور فلاں فلاں کتابیں آپ سے پڑھی ہیں۔ مجھے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے آپ سے بے پناہ محبت رہی ہے، اور میں یہاں اپنے احباب سے برابر آپ کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ آج کے اس جلسہ میں آپ کی تقریر و شرکت میں بھی میرے مشورہ و اصرار کا بڑا دخل ہے۔

جواب میں میرے پاس کھسیانی باتیں کرنے کے سوا کیا چارہ تھا؟ بس یہی کہ بھیا! تیس برس سے زیادہ کی مدت گذر گئی، ظاہر ہے کہ اس وقت تم نوعمر اور بے داڑھی مونچھ کے بچے رہے ہوگے، اتنے عرصہ کے بعد اس وضع قطع میں تمہیں دیکھ کر میں کیسے پہچان پاتا؟ اور پھر یہ تو تم جانتے ہی ہوگے کہ سال سال بھر سامنے بیٹھ کر روزانہ سبق پڑھنے والے طالب علموں کی جماعت کے تمام طلبہ کے نام دوران تعلیم و تدریس بھی میں نہیں یاد رکھ پاتا —— تو پھر اتنا لمبا عرصہ گذرنے کے بعد مجھ جیسے ''بھلکڑ'' کو تمہارا اتہ پتہ یاد نہیں رہا تو کون سی نئی نرالی بات ہے؟

موصوف نے خوش دلی کے ساتھ میرے عذر کو قبول کیا، اور از ان

مغرب تک ان سے پورے نشاط کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی، اس دوران انہوں نے اپنا نام کئی مرتبہ مجھے رٹاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس میں میری بھی کوتاہی رہی کہ آپ کی ممبئی آمد پر میں تعارف کے ساتھ آپ سے نہیں ملا۔ یوں تو متعدد جلسوں میں شریک ہو کر آپ کی تقریریں بھی سنیں اور مصافحہ بھی کیا، مگر بھیڑ بھاڑ میں اپنا تعارف پیش کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس خوشگوار مجلس کے بعد نماز مغرب، اور پھر حسب پروگرام جلسہ میں شرکت، اور نماز عشاء و کھانے سے فراغت کے بعد رات میں وہیں قیام کر کے صبح ۸/ بجے کے جہاز سے میری لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

اب قابل ذکر اپنی بلا ارادہ و بے تصنع کوتاہی ہے کہ اتنی تفصیلی ملاقات و گفتگو ہی نہیں، کھسیاہٹ سے دوچار ہونے کے باوجود مجھے اب حافظہ پر زور دینے کے باوجود ''ان امام صاحب'' کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اچانک ان کا آمنا سامنا ہو جائے تو پھر اسی ممبئی والی کیفیت سے دوچار ہونا پڑ جائے۔

بات زیادہ سے زیادہ ۵ سے ۷ برس ہی پرانی ہے، لیکن میری بھول جانے کی کمزوری کی ایک ''شاندار'' مثال ہے۔

اللہ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرنے کا سوا چارہ بھی کیا ہے —— لیکن یہ دعا ضرور ہے کہ حق تعالیٰ میری قوت حفظ میں بھی اضافہ کر دے۔ آمین۔

یوں تو مجھے اپنے خاندانی بزرگوں میں سے چھ پشت اوپر تک کے نام

والد ماجدؒ کی زبان سے متعدد مرتبہ سن کر یاد ہو گئے ہیں۔ میرے ایک دادا محمد اسرائیل فاروقی صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا کچھ اوپر تک کے بزرگوں کے ناموں کا باقاعدہ شجرہ بھی اتفاق سے میرے پاس موجود ہے، جو شجرہ کے ضابطوں کے مطابق ہے۔ اور اس میں والد صاحبؒ تک کی اولاد کے نام شاخ درشاخ ضابطہ کے مطابق درج ہیں۔ اب مجھے اچھی طرح یہ بھی یاد نہیں رہ گیا کہ وہ شجرہ میرے پاس کیسے آ گیا؟۔ چوں کہ میرے وہ دادا محمد اسرائیل صاحب مرحوم لاولد تھے۔ میرا ان کے پاس بچپن ہی سے جانا آنا تھا۔ وہ خود بھی موقع بہ موقع میرے گھر ملنے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر یہ شجرہ مجھے کئی مرتبی دکھایا بھی تھا، بہت بڑے سائز کے بادامی رنگ کے کاغذ پر پرانے انداز کی سیاہ روشنائی اور موٹے قلم سے خوبصورت اور جلی طور پر یہ شجرہ مجھے بچپن کی عمر میں بھی بہت اچھا لگتا تھا'' اور میں ان سے بار بار فرمائش کر کے دیکھتا بھی تھا اور ان سے یہ بھی کہتا تھا کہ دادا اس میں اب ہم لوگوں کے نام بھی لکھئے، جس کے جواب میں وہ اپنے بڑھاپے اور ضعف کا حوالہ دے کر کہتے کہ دیکھ رہے ہو یہ کتنا مشکل کام ہے؟۔ اب جہاں تک مجھ سے ہو سکا، میں نے لکھ دیا۔ اس میں اپنے اور اپنے بعد کی نسلوں کے نام تم لوگ لکھنا — ممکن ہے کہ ایسے ہی کسی موقع پر اسرائیل دادا مرحوم نے خود ہی یہ شجرہ میرے حوالہ کر دیا ہو؟ بہ ہر حال یہ ایک مستند قسم کا کچھ آدھا ادھورا شجرہ میرے پاس محفوظ ہے۔ پھر میرے عم زاد برادر محترم پروفیسر عبدالحئی فاروقی مرحوم نے اپنے جد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی

سوانح میں تو ان کا سلسلۂ نسب سیدنا فاروق اعظمؓ تک آباء واجداد کے ناموں کے ساتھ درج کیا ہے۔ معلوم نہیں بھائی صاحب مرحوم نے یہ نام کہاں سے حاصل کئے، اور ان کی اعتباری حیثیت کیا ہے؟۔

دراصل ہمارے عجمی ممالک میں باقاعدہ شجروں کی حفاظت کا شروع ہی سے کوئی اہتمام نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے نسبی کفاءت کے سلسلہ میں اس کی صراحت کی ہے کہ عجمیوں کے سلسلہ میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، صرف عربوں میں نسبی کفاءت (برابری) کا لحاظ کیا جائے گا۔ کیوں کہ انساب کی حفاظت کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے ''اَلْاَعَاجِمُ کُلُّھُمْ اَکْفَاءٌ'' یعنی تمام عجمی نسبی طور پر برابر ہیں — لیکن یہ حقیقت بھی بڑی مضحکہ خیز ہے کہ موجودہ وقت میں معاملہ بالکل الٹ گیا ہے۔ اور صورت حال یہ ہے کہ حکمراں سے لے کر عوام تک اَلْعَرَبُ کُلُّھُمْ سَوَاءٌ (تمام عربی لوگ نسبی طور پر برابر ہیں) کا منظر ہے، اور سوائے اردن کے حکمراں شاہ حسین مرحوم اور ان کے سلف وخلف کی ''ہاشمی'' شناخت کے کسی کی کوئی نسبی شناخت نہ ظاہر کی جاتی ہے نہ ہی اس کی کوئی تحقیق وتفتیش کرتا ہے۔ آل سعود اور آل نہیان وغیرہ جیسے لاحقہ یا سابقہ کا ذکر بھی کسی نسبی برتری یا کمتری کے اظہار کے لئے نہیں، بلکہ اپنے دور کے کسی نامی گرامی کی اولاد ہونے کے اظہار کے لئے بطور شناخت کیا جاتا ہے — جب کہ ہمارے عجمی ملکوں میں سادات، شیوخ، پٹھان، مغل وغیرہ اور پھر انصاری، منصوری، قریشی، سلمانی وغیرہ وغیرہ جیسی ''برادریوں'' سے وابستگی کا اظہار ''نسبی شناخت'' کے لئے کیا جاتا ہے

اوراس سلسلہ میں ''اونچ نیچ'' کے پیمانے بھی بہت ہی عجیب وغریب، نیز غیر شرعی وغیر عقلی علتوں کے ساتھ اس اہتمام وشدت کے ساتھ وضع کر لئے گئے ہیں کہ عام سماجی حیثیت سے لے کر شادی بیاہ تک میں ان کا لحاظ کیا جاتا ہے؟۔

یعنی موجودہ صورت حال کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عجمیوں کے یہاں ''نسبی کفاءت'' کا شدت کے ساتھ اعتبار واہتمام کیا جاتا ہے، جب کہ عربوں کے یہاں اس کا کوئی ذکر وچرچا بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے ملک میں تو لاکھوں، کروڑوں سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، عباسی، سلمانی، انصاری، منصوری اور قریشی وغیرہ جیسی نسبتوں سے اپنی ''نسبی حیثیت'' بیان کرنے والے مل جائیں گے۔ لیکن عربی ممالک میں ایسی کسی ''نسبی حیثیت'' کو بیان کرنے اور اس کا اظہار کرنے والا ڈھونڈھنے سے بھی کوئی نہیں ملے گا؟

بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدینؓ سے لے کر تمام اکابر صحابہؓ کی تمام اولاد واحفاد ہمارے ہندوستان اور اس جیسے چند دیگر عجمی ملکوں ہی میں منتقل ہو گئی۔ اور عرب کے ساتھ ہی دیگر ایشیائی، افریقی، اور یوروپی ممالک میں ان کی کوئی ایسی شاخ بھی باقی نہیں رہ گئی جن کے سہارے وہ لوگ بھی اپنے آپ کو سادات وشیوخ وغیرہ وغیرہ میں شمار کرا سکتے ؟۔

بات ذرا دور نکل گئی، اور ایک درد تھا جو موقع ملتے ہی چھلک پڑا؟۔

دراصل مجھے ذکر یہ کرنا تھا کہ میرے دادا کے دادا حکیم فضل علی صاحب مرحوم ہمارے کاکوری کے اجداد میں سے پہلے شخص ہیں جن کے ذاتی احوال بھی تفصیلی طور پر معلوم ہیں اور ہمارے موجودہ پورے خاندان کے وہی مورث اعلیٰ بھی ہیں۔

حکیم فضل علی صاحبؒ اپنے وقت کے بہت ہی نامور اور بافیض اطباء میں سے تھے۔ ان کے پاس دور دراز سے سفری صعوبتیں اٹھا کر مریض آتے، اور حق تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے ہوئے ان کے دست شفا وتشخیص سے صحت یاب ہوتے۔ لکھنؤ کے اس وقت کے مشہور ''اطبائے جھوائی ٹولہ'' کے خانوادہ میں بھی ان کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا، اور اپنے ہم وطنوں میں بھی انہیں ایک خصوصی قدر ومنزلت حاصل تھی۔

حکیم فضل علیؒ کے تین بیٹوں میں سب سے بڑے مولوی حافظ الشاہ محمد ناظر علی صاحبؒ میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبد الحلیم صاحبؒ کے دادا، اور سب سے چھوٹے بیٹے حکیم یوسف علیؒ صاحب ''نانا'' تھے۔

مولوی ناظر علی صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو کر تحصیل دار کے منصب پر فائز ہوئے۔ وہ اپنے والد حکیم فضل علی صاحبؒ کی جگہ پر ایک ماہ کے لئے عوضی میں تحصیل کے محرر کی حیثیت سے گئے جو علالت کی وجہ سے ایک ماہ کی چھٹی پر تھے۔ مگر پھر والد نے ریٹائرمنٹ لے کر اپنی جگہ پر ان کا مستقل تقرر کرا دیا۔ اپنی حسن کارکردگی کی وجہ سے یہ جلد ہی قانون گو، پھر نائب تحصیل دار، اور اس کے بعد تحصیل دار

کے منصبوں پر فائز ہوتے چلے گئے۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں انگریز حکام کی طرف سے تحصیل دار ہوتے ہوئے ضلع مجسٹریٹ کے اختیارات بھی سونپ دیئے گئے۔ اور اسی منصب پر رہتے ہوئے ۱۸۹۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

سادگی، دیانت داری، اور اپنی دینی وضع قطع کے ساتھ فرائض منصبی کی ادائیگی میں اہتمام کا یہ عالم تھا کہ مسٹر رستم جی کلکٹر فتح پور نے اپنے ماتحت تمام تحصیل داروں کے نام ایک سرکولر جاری کر کے اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ مولوی ناظر علی تحصیل دار کو نمونہ بنا کر ان ہی کی طرح فیصلے لکھا کریں۔

جب وہ ضلع باندہ کی تحصیل کماسن سے ریٹائر ہونے پر اپنے کلکٹر مسٹر سمسن سے آخری ملاقات کے لئے گئے تو ان سے کہا کہ ''دوران ملازمت کچھ سرکاری کاغذ اور روشنائی وغیرہ کا استعمال میرے نجی کاموں میں بھی ہوا ہے۔ تو میری خواہش ہے کہ آپ اس کی اطلاع گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام کو دے کر مجھے معاف کرا دیں۔ تاکہ اللہ کے یہاں میری پکڑ نہ ہو۔'' ان کی اس بات سے انگریز کلکٹر اتنا متاثر ہوا کہ جب وہ لکھنؤ میں تبادلہ ہو کر ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے آیا تو خاص طور پر کاکوری پہنچ کر ان سے ملاقات کی۔ اور ان سے باصرار کاکوری کے آنریری مجسٹریٹ کے عہدہ کی پیش کش کی۔ جس کو انہوں نے معذرت کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی کے ساتھ وقت کے مایۂ ناز بزرگ وشیخ طریقت حضرت شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (جد امجد حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ یعنی حضرت مولانا کے والد ماجد مولانا حکیم عبدالحئی حسنیؒ کے ماموں) سے بیعت وارادت کا رشتہ قائم

کر کے انہوں نے منازل سلوک طے کرتے ہوئے نہ صرف اپنے شیخ کا اعتماد حاصل کیا بلکہ ان کے شیخ کو اپنے اس مرید خاص سے ایسی والہانہ محبت تھی کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اس ہونہار و باکمال روحانی فرزند کے لئے دعائیہ اشعار و نظمیں بھی کہیں۔ والد ماجدؒ کی زبان سے سنے ہوئے ایسی ہی ایک نظم کے یہ دو شعر یاد رہ گئے ؎

پایہ ناظر علی کا بالا ہو ......☆...... نگہباں ان کا حق تعالیٰ ہو

ہو اولاد ان کی ہنر والی ......☆...... پائے منصب عالی عالی

یوں تو مولوی محمد ناظر علی صاحب کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ کل آٹھ اولاد ہوئیں، لیکن ان میں سے ایک بیٹے عبدالرحمن اور تین بیٹیوں کی ان کی زندگی ہی میں وفات ہوگئی تھی۔ ان کے بعد باقی رہ جانے والے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں میں سب سے بڑے امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحبؒ اور سب سے چھوٹے بیٹے میرے حقیقی جد امجد جامع العلوم حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ تھے۔ دونوں بھائیوں کی عمروں کے درمیان تیرہ برس کا فاصلہ تھا، مگر اللہ کی مشیت کہ چھوٹے بھائی کا ۱۹۵۶ء میں بعمر ستر سال بڑے بھائی کی موجودگی ہی میں انتقال ہوگیا، جب کہ بڑے بھائی کا ۱۹۶۲ء میں بعمر نواسی سال انتقال ہوا۔ اور دونوں بھائیوں کی تدفین لکھنؤ کے محلہ چکمنڈی کے چپ شاہ میاں کے مدفن میں ہوئی۔

دونوں بھائیوں کے درمیان مثالی محبت تھی۔ چھوٹے بھائی اپنے بڑے بھائی کا اس طرح احترام کرتے تھے کہ آج کے دور میں لائق سے لائق

بیٹا بھی اپنے باپ کا نہیں کر پاتا۔ جب کہ بڑے بھائی کا سلوک بھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنے حقیقی فرزندوں جیسا بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام اہل سنتؒ اپنے دو جوان العمر فرزندوں مولانا عبدالغفور صاحبؒ اور مولانا عبدالعزیز صاحبؒ نیز ان سے پہلے اپنے ایک کم سن بیٹے کی وفات پر اتنے مغموم نہیں ہوئے جتنے اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی وفات پر ہوئے تھے۔

میرے والد ماجدؒ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی وفات اپنے اکلوتے بیٹے یعنی میرے والد ماجد مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کے رہائشی مکان کے باہری کمرہ میں ہوئی تھی۔ اس کمرہ کو ان کے بڑے ابّا حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے یہ کہہ کر کھلا رہنے کا حکم دیا تھا کہ جب میاں عبدالرحیم کی یاد آئے گی تو میں اس کمرہ میں کچھ وقت گذار کر اور ان کے لئے ایصال ثواب کر کے اپنے قرار وسکون کا کچھ سامان کر لیا کروں گا۔ چنانچہ کئی ہفتہ تک ان کا یہ معمول رہا کہ ہر روز ایک مرتبہ اور کبھی کبھی دو دو مرتبہ خاموشی کے ساتھ اس کمرہ میں اس طرح آتے کہ اس گھر کے مکینوں کو بھی بسا اوقات خبر نہ ہو پاتی اور کافی کافی دیر تک قرآن مجید کی تلاوت کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو ایصال ثواب کرتے۔

البدر کے ''امام اہل سنت نمبر'' میں شائع ہونے والے ''دو مثالی بھائی'' کے زیر عنوان اپنے مضمون میں والد ماجد نے دونوں بھائیوں کی مثالی محبت وسلوک کے کچھ واقعات بھی بہ طور استشہاد رقم کئے تھے جن سے بہ خوبی اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ شفقت واحترام کے ایسے سلوک کا موجودہ نفسا نفسی اور خود غرضی ومفاد پرستی کے ماحول میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا؟۔

یہ بھی بڑا عجیب اتفاق ہوا کہ بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی جوان ہو کر شادی بیاہ کے لائق ہوئے، اور چھوٹے بھائی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا جوان ہو کر شادی بیاہ کے لائق ہوئے۔ پھر دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی اکلوتی اولاد کو رشتۂ نکاح سے جوڑ کر آگے کے لئے خلوص ومحبت کے اس رشتہ کا تسلسل قائم رکھنے کا سامان تو کیا، مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی تھا، اور بڑے بھائی کی بیٹی یعنی میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کی پہلی اہلیہ صاحبہ کا پہلے ہی بچہ کی ولادت کے سلسلہ میں شادی کے ایک سال کے اندر ہی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد میرے والد ماجدؒ نے میری والدہ صاحبہ مرحومہ سے عقد ثانی کیا اور ان ہی سے والد صاحبؒ کی نسل چلی۔ یوں تو میری والدہ صاحبہؒ کے بطن سے پانچ بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں مگر ان میں سے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا بہت کم سنی ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور ہمارے والدین کی نسل ہم چار بھائیوں اور تین بہنوں سے چلی۔

میرے والد ماجدؒ اپنے پہلے نکاح کا حال کبھی کبھی بڑے دل چسپ انداز میں بیان کرتے تھے جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی اِنَّ اَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَۃً اَیْسَرَہٗ مَؤُنَۃً (یعنی سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جس میں سب سے زیادہ سہولت وآسانی ہو) کی بہترین

مثال تھا——اور ایسا کیوں نہ ہوتا، کہ دونوں بھائی اپنے وقت کے جید اور باعمل عالم تھے۔ پھر ان کے بیٹے بیٹی بھی دینی تربیت کے شاہ کار تھے؟

اپنے نکاح کے سلسلہ میں والد صاحبؒ نے بتایا کہ اس وقت ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی، اور غالباً دارالعلوم دیوبند میں ان کا آخری دورۂ حدیث کا سال تھا۔ وہ کسی تعطیل کے موقع پر گھر آئے ہوئے تھے، اور ان کا قیام کاکوری کے اپنے موروثی مکان میں تھا کہ اچانک ایک دن ایک ہرکارہ ان کے والد یعنی میرے دادا صاحب کا ایک مختصر سا خط لے کر پہنچا۔ جس میں انہیں بتلایا گیا تھا کہ تم بلا تاخیر لکھنؤ کے لئے اس طرح روانہ ہو جاؤ کہ نماز عصر ہمارے ساتھ مسجد میں ادا کر سکو۔ چنانچہ تعمیل حکم میں انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر نماز عصر اپنے محلہ پاٹانالہ کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد اعلان کیا گیا کہ ابھی ایک نکاح ہوگا، اس میں آپ تمام حضرات شرکت کریں۔

فرنگی محل لکھنؤ کے ایک عالم حضرت مولانا محمد اسلم صاحبؒ نے خطبۂ نکاح پڑھا، (جن کو خاص اسی مقصد کے لئے حضرت امام اہل سنتؒ نے بلوایا تھا) خطبہ کے بعد حسب روایت انہوں نے امام اہل سنتؒ کی بیٹی کے نام اور مہر کی صراحت کے ساتھ کلمات ایجاب ادا کر کے والد صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ نکاح قبول ہے؟ والد صاحب چوں کہ اس وقت تک اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کا نکاح ہے۔ وہ کاکوری سے اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں آئے تھے۔ ان کے بدن پر وہی کپڑے تھے جو اس وقت وہ پہنے تھے۔ کاکوری میں ان کی بہنوں کو بھی اس کی کوئی خبر نہ تھی کہ ان کے اکلوتے اور

دلارے بھائی کو نکاح کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت مولانا فرنگی محلیؒ نے نکاح قبول کرنے کی دعوت دی تو والد صاحب کی یہی سمجھ میں آیا کہ کسی دوسرے کے ساتھ ان کی چچازاد بہن کا نکاح ہو رہا ہے، مگر کس سے؟ انہوں نے تجسس کے ساتھ اپنے پہلو میں بیٹھے ایک رشتہ کے بھائی عبید اللہ صاحب مرحوم کی طرف دیکھا کہ شاید ان ہی کے ساتھ یہ نکاح ہو رہا ہے۔ تب نکاح خواں حضرت مولانا فرنگی محلیؒ نے والد صاحب کی ٹھوڑی میں ہاتھ دیتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا ”میاں صاحبزادے! میں آپ سے پوچھ رہا ہوں“——یعنی نکاح سے چند منٹ قبل تک بھی والد صاحب کو اس کی اطلاع نہیں ہو سکی تھی کہ ان کا نکاح ہونا ہے۔ دوسری طرف ان کی ہونے والی اہلیہ کا معاملہ یہ تھا کہ جب ان سے نکاح کی اجازت لی گئی تب وہ اپنے ہونے والے نکاح سے بے خبر روزمرہ کے گھریلو کاموں میں مشغول تھیں، اور جوں ہی ان کے سامنے ان کے نکاح کی بات رکھی گئی وہ آدھا ادھورا گندھا ہوا آٹا چھوڑ کر کونے کنارے چلی گئی تھیں——اس سادگی اور شرعی پابندیوں کی رعایت کے ساتھ ہوا تھا یہ نکاح!

کیا آج کے ماحول میں اس طرح سے نکاح کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

میں چوں کہ آٹھ برس کی عمر ہونے تک اپنے دادا کا اکلوتا پوتا اور نانی کا اکلوتا نواسا رہا، اور مجھ سے چھوٹے بھائی عبدالولی کی ولادت اس وقت ہوئی جب دادا صاحبؒ کی وفات ہو چکی تھی۔ گویا ان کی زندگی میں تو ان کے

اکلوتے بیٹے کا اکلوتا بیٹا ہی رہا، جب کہ مجھ سے بڑی دو اور مجھ سے چھوٹی ایک، کل تین بہنیں تھیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے بعد میرے تین بھائی عبدالولی، عبدالکریم، اور عبدالوحید کی ولادتوں نے بھائیوں کی تعداد زیادہ اور بہنوں کی تعداد کم کردی تھی۔ لیکن میرے دادا صاحبؒ نے میرے تینوں چھوٹے بھائیوں کو نہیں دیکھا تھا، جب کہ نانی صاحبہ نے ہم چاروں بھائیوں کو بھی دیکھا، اور عبدالوحید کے سوا تینوں بھائیوں کی شادی بیاہ، اور بچوں کو بھی دیکھا۔ اس خصوصیت کی وجہ سے مجھے اپنے دادا اور نانی کا پیار بھی سب سے زیادہ ملا۔ دادا صاحب کی وفات کے وقت میری عمر غالباً چھ برس کی بھی نہ تھی، مگر ان کے ٹوٹ کر چاہنے اور ان کے بل بوتے پر اپنی اکڑ دکھانے کے کچھ واقعات اب بھی یاد ہیں —— لیکن ان تمام چاؤ چونچلوں کے ساتھ ہی دادا صاحب اور نانی صاحبہ دونوں ہی کے مجھے ایک اچھا حافظ و قاری اور عالم باعمل بنانے کی فکر رہی۔ چنانچہ میری باقاعدہ پڑھائی کا سلسلہ اس وقت شروع کرادیا گیا تھا جب اس عمر کے بچے قاعدہ بغدادی بھی شروع نہیں کرتے تھے۔ اور غالباً اسی لئے مجھے قرآن مجید ناظرہ اپنی پڑوسن خالہ جان سے اور حفظ مدرسہ تجوید الفرقان کے اساتذہ سے پڑھنا تو یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ گھر پر نانی صاحبہ مجھے لے کر بیٹھتیں۔ وہ پنکھا جھلتی رہتیں اور میں اپنا سبق یا آموختہ یاد کرتا رہتا —— لیکن یہ یاد نہیں کہ میں نے قاعدہ بغدادی پڑھا بھی ہے یا نہیں؟

یہی حال اردو زبان کی تعلیم کا بھی رہا کہ میں نے اس دور کی رائج

''چمن اردو''، ''اردو زبان کا قاعدہ'' اور ''بیسک ریڈر (اردو)'' وغیرہ جیسی کسی کتاب کو کسی استاذ کے روبرو نہیں پڑھا۔ اردو کی ابتدائی جو کچھ ''بے ضابطہ تعلیم'' ہوئی وہ اس طرح کہ مجھ سے دو برس بڑی میری بہن صاحبہ جب اپنا بستہ کھول کر بیٹھتیں تو موقع ملنے پر میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ جاتا اور ان ہی کی کتابوں کو کچھ خود ہی الٹ پلٹ کر اور کچھ ان سے یا سب سے بڑی بہن مرحومہ سے پوچھ پاچھ کر اپنے شوق سے پڑھ لکھ لیا کرتا۔ اور یہ سلسلہ ان کے پانچواں درجہ پاس کرنے اور میرا حفظ قرآن مکمل ہونے تک جاری رہا۔ اس کے بعد درجہ تجوید میں داخل ہونے پر معرفۃ التجوید، اور فوائد مکیہ جیسی اردو کتابوں کا پڑھنا، اور سمجھ کر پڑھنا، میری مجبوری بنا تو جیسی تیسی، ٹوٹی پھوٹی اردو زبان کا پڑھنا لکھنا آ ہی گیا۔ پھر آگے کی تمام تر تعلیم چوں کہ ''اردو میڈیم'' میں ہوئی، اس لئے خود بہ خود اردو زبان و ادب سے مناسبت بڑھتی گئی —— اور اب اس زبان کے حوالہ سے جو کچھ، اور جیسا کچھ ہوں، آپ کے سامنے ہوں؟۔

البتہ انگریزی زبان پڑھنے، لکھنے، اور اس کے قواعد (گرامر) سیکھنے کا مجھے شروع ہی سے بہت شوق رہا، اور اسے میں نے متعدد اساتذہ سے باقاعدہ اور مرحلہ وار سیکھا اور اس میں کسی نہ کسی حد تک استعداد پیدا کرنے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ انگریزی زبان کی بات آئی تو ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے انگریزی کے ایک استاذ مولوی رحمت اللہ صاحب تھے۔ میرے دادا کی عمر کے ایک ضعیف العمر آدمی تھے، جو اپنے بیٹے کی نالائقیوں سے عاجز

آ کر والد صاحبؒ کے پاس آ گئے تھے۔ اپنے زمانہ کا ہائی اسکول پاس تھے، مگر انگریزی زبان پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ بے تکلف فر فر انگریزی بولتے، انگریزی گرامر، الفاظ کے تلفظ اور اس کی اسپیلنگ پر بہت توجہ دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے ابتدائی انگریزی پڑھاتے ہوئے انگریزی لفظ What (کیا) کا میرا تلفظ انہوں نے میری زبان اور ہونٹوں کو پکڑ پکڑ کر بڑی مشکل سے درست کرایا تھا۔ وہ الفاظ کا تلفظ انگریزوں کی طرح کرنے کرانے پر زور دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ اہل زبان کا تلفظ ہی مستند و معتبر ہوتا ہے۔ ہم ہندوستانی لوگ انگریزی اور عربی الفاظ کا تلفظ بھی اپنے اردو لب ولہجہ میں کرتے ہیں، جو غلط ہے۔

بہ ہر حال لطیفہ یہ ہوا کہ میرے ایک چچازاد بھائی حفیظ اللہ صاحب مرحوم (جو بعد میں میری ہمشیرہ سے عقد کے بعد میرے بہنوئی بھی ہو گئے تھے) میرے یہاں رہ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم-اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چوں کہ ان کا قیام گھر کے ایک باہری کمرہ میں تھا جو گھر کے زنان خانہ سے الگ تھا۔ اس لئے مولوی رحمت اللہ صاحب مرحوم سے بھی ان کی خوب چھنتی تھی۔ ایک دن بات کچھ انگریزی زبان کی آ گئی تو مولوی صاحب مرحوم نے کہا کہ اب آپ لوگوں کے دور میں پڑھائی لکھائی کہاں ہوتی ہے؟ انگلش میڈیم کہے جانے والے اسکولوں میں بھی بس کچھ رٹی رٹائی چیزیں پڑھا دی جاتی ہیں، زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں انگریزی ادب کے ساتھ ہی تمام مضامین کی تعلیم بھی انگریزی زبان میں

ہوتی تھی۔ اکثر اسکولوں میں انگریز اساتذہ بھی ہوا کرتے تھے جو اپنے لب ولہجہ میں متعلقہ مضامین کی تعلیم دیتے اور طلبہ میں مڈل کلاس کے بعد اتنی لیاقت ہو جاتی تھی کہ وہ بے تکلف انگریزی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ اسی لئے آج کل کے بی-اے، ایم-اے لڑکوں سے کہیں زیادہ لیاقت ہمارے دور کے ہائی اسکول پاس لوگوں میں ہوتی تھی۔

میرے حفیظ بھائی جان مرحوم کو بھی انگریزی زبان سے اچھی مناسبت تھی، اس لئے انہوں نے مولوی صاحبؒ سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے ان کے روبرو کچھ انگریزی جملے بول کر گویا انہیں چیلنج کر دیا۔ مولوی صاحب نے جھنجھلا کر کہا پہلے میرے صرف تین اردو لفظوں کا صحیح انگریزی ترجمہ، صحیح اسپیلنگ اور تلفظ کے ساتھ کر دیجئے تب میں آپ کو انگریزی میں بات کرنے کا اہل تسلیم کروں گا۔ جواب میں آپ چاہیں تو اپنی پسند کے ایسے ہی بیس الفاظ مجھ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اگر ایک کا بھی صحیح جواب نہ دے سکا تو اپنی بات واپس لے لوں گا۔ پھر حفیظ بھائی جان کی رضامندی پر مولوی صاحب نے ان کے سامنے پہلا لفظ کبوتر پیش کر کے اس کا انگریزی متبادل دریافت کیا۔ حفیظ بھائی جان نے فوراً ہی جواب میں کہا Pigeon۔ پہلے تو مولوی صاحب نے اس انگریزی لفظ کا دو تین مرتبہ میں تلفظ درست کرایا۔ اس کے بعد اس کی اسپیلنگ (ہجے) پوچھ لی۔ اور بس اسی میں حفیظ بھائی جان اٹک گئے۔ کئی طرح سے انہوں نے اس لفظ کی اسپیلنگ بیان کی، اور ہر مرتبہ مولوی صاحب گردن ہلا ہلا کر اس کی نفی کرتے رہے۔ آخر میں اپنی شکست

تسلیم کر کے انہوں نے مولوی صاحب سے اس لفظ کی صحیح اسپیلنگ دریافت کی تو انہوں نے درج بالا اسپیلنگ بتائی، جو اسی وقت سے مجھے ازبر ہوگئی۔ جب کہ حفیظ بھائی جان مرحوم اور ان کے ایک ہم سبق ساتھی مجیب صاحب مرحوم کھسیا کر رہ گئے تھے۔

مولوی صاحب مرحوم سے ابتدائی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مجھے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ میرے اندر کسی درجہ میں انگریزی الفاظ کی اسپیلنگ کی ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ اکثر غیر مانوس اور ایسے الفاظ جن کا ترجمہ بھی میں نہیں جانتا، جب میرے سامنے صحیح تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں تو میں ان کی صحیح اسپیلنگ بتانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتا ہوں۔ یقیناً یہ فیض ہے مولوی رحمت اللہ مرحوم کا — اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

چوں کہ میں اپنے دادا صاحب مرحوم کی زندگی میں ان کا اکلوتا پوتا، اور اپنی نانی کا پہلا نواسہ نیز والدین کا پہلا بیٹا تھا (مجھ سے پہلے میرے والدین کے ایک بیٹے کی اور بھی ولادت ہوئی تھی، لیکن میری پیدائش سے پہلے بچپن ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا) اس لئے لاڈ پیار کے ساتھ میری تعلیم و تربیت پر بھی سب کی، خصوصاً دادا صاحبؒ کی خاص نظر تھی۔ اور چار پانچ برس کی عمر سے ہی حفظ قرآن مجید کے لئے میرا مدرسہ جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب اس عمر کے بچے حفظ کی تعلیم تو دور، اسکولوں و مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں بھیجے جاتے تھے۔ چار برس کی عمر ہو جانے کے بعد تو بسم اللہ خوانی کی رسم ہوتی تھی؛ وہ بھی پڑھے لکھے

گھرانوں میں۔ عام گھرانوں میں تو ۸۔۱۰ برس کی عمر ہو جانے پر بچوں کو پڑھانے لکھانے کے بارے میں سوچا جاتا تھا۔ جب کہ اس عمر کو پہنچتے پہنچتے بفضلہٖ تعالیٰ میرے حفظ کلام اللہ کی تکمیل ہو چکی تھی۔

مجھے بچپن میں پیشاب بہت ہوتا تھا، خصوصاً مدرسہ میں پڑھائی کے دوران پیشاب کی حاجت ہوتی تو استاذ سے اجازت لے کر پیشاب خانہ جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ میں قریب قریب روزانہ ہی میرا پیشاب نکل جانے کی وجہ سے میرے پائجامہ کے ساتھ ہی مدرسہ کا ٹاٹ بھی گندا ہو جاتا، جسے میرے مدرسہ تجوید الفرقان کے چپراسی فقیرے مرحوم کو دھونا اور پاک کرنا پڑتا تھا۔ بار بار ایسا ہونے پر میرے استاذ نے حکم دیا کہ تم اپنا روئی کا گدا ساتھ میں لے کر آیا کرو، اور درجہ میں اسی پر بیٹھا کرو۔ تاکہ مدرسہ کے ٹاٹ گندے نہ ہوں۔ استاذ کے حکم کی تعمیل میں مجھے گدا لے جانا پڑتا تھا، مگر اسے بغل میں دبا کر لے جاتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی، اور والدین کے حکم پر یہ کام میرے بڑی بہن کو بادل ناخواستہ اور روتے دھوتے انجام دینا پڑتا تھا، جو میرے ساتھ ہی اسی مدرسہ کے شعبۂ نسواں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتی تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب سے میرے ساتھ گدا جانے لگا، میرا پیشاب چھوٹنا بھی بند ہو گیا۔ اور ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرا اپنے گدے پر پیشاب نکل گیا ہو۔ فقیرے مرحوم کو اس کی بڑی شکایت رہتی کہ مجھے ستانے کے لئے ہی ٹاٹ پر پیشاب کرتے تھے، اپنے گدے پر کیوں نہیں کرتے ہو؟ اور یہ شکوہ فقیرے مرحوم میری مدرسہ سے فراغت کے بعد بھی ملاقات

ہونے پر ہنس ہنس کر کیا کرتے تھے ——— اکثر اس شکوہ شکایت کا موقع اس وقت ملتا جب جاڑوں کے موسم میں رات کے وقت فقیرے مرحوم پھیری کرتے ہوئے مونگ پھلی بیچنے کے لئے آتے۔ فقیرے کی مونگ پھلیاں ایسی ہوتی تھیں کہ گھروں میں بیٹھ کر لوگ ان کی پاٹ دار صدا ''آٹھ آنے پوّا، بھئی آٹھ آنے پوّا ——— یہ کراری بھنی، نئی مونگ پھلی، آٹھ آنے پوّا'' کا انتظار کرتے۔ عام طور پر اس وقت مونگ پھلی چار آنے پاؤ بکتی تھی، مگر فقیرے کی مونگ پھلی، اتنی لذیذ، اتنی بڑی اور اتنے بھرے ہوئے دانہ کی خستہ وسوندھی ہوتی کہ لوگ خوشی خوشی دوگنی قیمت پر اسے خرید لیا کرتے تھے ——— میں بھی ان لوگوں میں تھا جن کو فقیرے کی صدا کا انتظار رہتا۔ اور جب فقیرے کی مونگ پھلی خریدنے کے لئے ان سے ملتا تو اکثر وہ اپنا شکوہ کرنا نہ بھولتے کہ واہ بھیا واہ ——— اپنے گدّے پر ایک دن بھی پیشاب کر لیتے تو مجھے صبر آ جاتا ——— تم تو بس مجھے تنگ کرنے کے لئے ہی ٹاٹ پر پیشاب کرتے تھے ——— اتنا کہنے کے ساتھ آخر میں وہ یہ بھی کہنا نہیں بھولتے تھے کہ ''بھیا! برا نہ ماننا'' یہ ہنسی میں کہتا ہوں''۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر ۱۸-۲۰ برس ضرور رہی ہوگی۔ دادا صاحب کی تو میرا حفظ شروع کرانے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد وفات ہوگئی تھی۔ اس وقت میری عمر اتنی کم تھی کہ براہ راست چند باتوں کے سوا ان کی باتیں نہ میں سمجھ سکتا تھا نہ ہی مجھے یاد رہیں۔ البتہ نانی صاحبہ مرحومہ کی زبانی اپنے تعلق سے سنی ہوئی بہت سی ایسی باتیں یاد ہیں جن سے دادا

صاحبؒ کے جذباتی لگاؤ نیز میرے سلسلہ میں ''ان کے خوابوں'' کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر نانی صاحبہ کے بیان کے مطابق قرآن مجید حفظ کے سلسلہ میں مجھے مشقت اٹھاتے اور محنت کرتے دیکھ کر بسا اوقات نانی صاحبہ سے اپنی بے چینی کا یوں اظہار کرتے کہ

''وافیہ (نانی صاحبہ کا نام)۔ (واضح رہے کہ میں ان دونوں ہستیوں کے لئے اتنا اہم تھا کہ دونوں کے درمیان مجھے موضوع گفتگو بنا کر کافی کافی دیر تک بات ہوا کرتی تھی) میں خود حفظ قرآن کی نعمت حاصل نہیں کر سکا، نہ ہی میرے اکلوتے بیٹے عبدالحلیم حافظ قرآن ہوئے۔ اس لئے میری دلی خواہش اور تمنا تھی کہ میرا یہ پوتا حافظ قرآن ہو جائے۔ اپنی اس چاہت کو پورا کرنے کے لئے میں نے اس کی عمر اور بچپن کا بھی خیال نہیں کیا، اور اس کا حفظ شروع کرا دیا۔ اب جو اس کو اس طرح محنت کرتے دیکھتا ہوں تو بعض وقت دل بہت بے چین ہو جاتا ہے، اور یہ خیال آتا ہے کہ کہیں میں نے ''خود غرضی'' تو نہیں کی؟ بہر حال اب تو شروع کرا ہی دیا ہے۔ ذہین ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد میرا بیٹا حافظ قرآن ہو کر میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنے گا۔ اللہ آسانی پیدا فرمائے۔''

کم و بیش نانی صاحبہ نے ان ہی الفاظ میں دادا صاحبؒ کے تاثرات کو متعدد مرتبہ میرے سامنے بیان کیا ——— جس سے دادا صاحبؒ کی میری

ذات سے جذباتی وابستگی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ دادا صاحبؒ مجھے اپنی زندگی میں حافظ قرآن بنا نہیں دیکھ سکے۔ یعنی

عید ہوئی ذوق، و لے شام ہوئی

کچھ ایسا ہی اتفاق میری منہ بولی خالہ جان صاحبہ کے ساتھ بھی ہوا، جو تھیں تو میری پڑوسن، لیکن ایک مرتبہ والدہ مرحومہ نے ان کو اور انہوں نے والدہ صاحبہ کو جو بہن کہا تو پھر دونوں میں کچھ ایسا رشتہ بن گیا کہ دو حقیقی بہنوں کے لئے بھی قابل رشک ہو۔ ان کی تو کوئی اولاد نہ تھی، لیکن ہم سب بھائی بہن انہیں خالہ جان اور ان کے شوہر نور احمد صاحب مرحوم کو خالو میاں کہتے تھے۔ اور اس رشتہ کی محبتیں بھی وصول کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے مکان ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ درمیان میں کوئی دوسری دیوار بھی نہ تھی، پھر بھی خالہ جان مرحومہ نے اصرار کرکے میرے مکان کے کمرہ سے اپنے مکان میں داخلہ کے لئے کھڑکی کھلوالی تھی، تاکہ رات و دن میں جب چاہیں آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے گھر آ جا سکیں۔

تین بہنوں کا اکیلا بھائی ہونے کے ناطے میں خالہ جان کا بھی اکلوتا بھانجہ تھا۔ اس لئے اپنے دیگر اعزہ کی طرح خالہ جان مرحومہ کی شفقتیں و عنایتیں بھی مجھے زیادہ حاصل تھیں۔ خالو میاں مرحوم کا اپنے گھر ہی کے ایک حصہ میں نگینہ سازی کا کارخانہ تھا۔ جس میں کم و بیش نصف درجن کاریگر کام کرتے تھے۔ گھر میں کافی خوش حالی تھی، اور کھانے والے افراد صرف دو میاں بیوی ہی تھے۔ اس لئے خالہ جان کی حقیقی بہنوں بھائیوں اور ان کی

اولاد کا کثرت کے ساتھ آنا جانا اور قیام کرنا ہوا کرتا تھا۔ ان کے ایک بھانجے صابر مرحوم اور ان کی کئی بہنیں تو خالہ جان ہی کے یہاں پلے بڑھے تھے۔ اور اس ناطہ سے صابر مرحوم گویا میرے خالہ زاد بھائی اور اس سے بڑھ کر دوست تھے —— افسوس کہ یہ رشتہ بہت کم عمری ہی کی منزل میں گھن لگ کر مرجھا سا گیا تھا۔ کیوں کہ ابھی ہم دونوں بلوغ کی عمر کو بھی نہ پہنچے تھے کہ وہ پیڑ ہی ڈھا گیا جس کے سایہ میں ہم کھیلتے کودتے اور دوستی یا برادرانہ رشتہ کو پروان چڑھاتے تھے۔ یعنی خالہ جان مرحومہ دیگر بہت سی حسرتوں کے ساتھ یہ حسرت لئے بھی اس دنیائے فانی سے چل بسیں کہ ان کا بھانجہ اور ناظرہ قرآن مجید کا شاگرد عبدالعلی جلد ہی پڑوس کی مسجد میں نماز تراویح میں قرآن مجید سنائے گا، اور وہ اس کا جشن منائیں گی۔

مجھے یاد ہے کہ میں جب نماز تراویح میں قرآن مجید سنانے کے لئے پہلی مرتبہ مصلّے پر کھڑا ہوا تھا تو خالہ جان مرحومہ کو یاد کرتے ہوئے باقاعدہ رو رہا تھا —— اور پھر جس دن میرا تراویح میں قرآن مجید مکمل ہوا اس دن تو باقاعدہ ''جشن گریاں کا اہتمام'' ہوا تھا، کیوں کہ قہقہوں، چہچہوں اور خورد و نوش کے درمیان سب ہی کو دادا صاحب مرحوم اور خالہ جان مرحومہ کی یادیں بھی بے چین کئے ہوئے تھیں —— سچ کہا کہنے والے نے کہ ع

یہ دنیا، اس کا کیا ہے، ہے نہیں ہے ☆ ہماری دولت جاوید، دیں ہے

مدرسہ تجوید الفرقان سے حفظ قرآن مجید، اور پھر اس کے ایک سال

بعد تجوید بروایۃ حفص (اس تعلیمی سال کے دوران امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی وفات بھی ہوئی تھی) کی تعلیم کے بعد میری عربی تعلیم کا آغاز دارالمبلغین (یا زیادہ صحیح طور پر "جامعہ عربیہ خزینۃ العلوم" میں ہوا۔ جس کو دارالمبلغین ہی کا شعبۂ درس نظامی کہنا مناسب ہوگا۔ کیوں کہ حضرت امام اہل سنتؒ کا قائم فرمودہ ادارہ دارالمبلغین تو صرف ان فضلائے مدارس کے لئے قائم کیا گیا تھا جن کے لئے تقابل ادیان کا دوسالہ نصاب تھا، اور اس کی حیثیت گویا "تخصص فی الادیان" کی تھی۔ اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد تعلیمی و تربیتی ادارہ تھا، جس کے مستفیدین میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا عبدالستار تونسویؒ، حضرت مولانا لال حسین اخترؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمن سلطانپوریؒ، حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن خیرآبادی، حضرت مولانا کلیم اللہ الہ آبادیؒ، اور حضرت مولانا کلیم اللہ بہرائچیؒ جیسے ہند و پاک کے اکابر و اعاظم شامل تھے اور جس میں محاضرہ کے لئے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ اور مناظر اسلام حضرت مولانا مرتضٰی حسن چاند پوریؒ جیسی بحر العلوم کہی جانے والی شخصیتوں کی تشریف آوری ہوا کرتی تھی) جامعہ عربیہ خزینۃ العلوم کا قیام غالباً اسی تعلیمی سال سے اس ضرورت کے پیش نظر ہوا تھا کہ دارالمبلغین کے اپنے مخصوص نصاب کے مطابق پڑھنے پڑھانے اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس لئے کچھ مخلصین اور اہل تعلق کے اصرار پر ذمہ داران دارالمبلغین نے جس کے سرخیل میرے والد ماجد

حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ تھے۔ شعبہ درس نظامی بہ نام "جامعہ عربیہ خزینۃ العلوم" قائم کیا تھا۔ اس نام میں ایک کشش یہ تھی کہ بہت پہلے میرے دادا صاحب مرحوم نے اسی نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو ان کی اپنے بڑے بھائی کے قائم فرمودہ ادارہ دارالمبلغین سے وابستگی کے بعد (یا اس سے پہلے ہی) بند ہو گیا تھا۔

میرا اس مدرسہ میں جس وقت داخلہ ہوا وہ اس کا ابتدائی دور تھا، لیکن با قاعدہ عربی درجات قائم تھے، اور نہایت منجھے ہوئے اور قابل اساتذہ تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ جن میں سب سے اہم اور ناقابل فراموش شخصیت استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنویؒ کی تھی، جو اپنے استاذ محترم حضرت امام اہل سنتؒ کی طرح کسی نامی گرامی مدرسہ کے فاضل تو نہ تھے، مگر درسیات پر ایسا عبور اور تفہیم کی ایسی قابل رشک صلاحیت تھی جس کی مثال مجھے اپنے پورے دور تعلیم و تدریس میں دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب شیخ الحدیث کے سوا کوئی دوسری نہ مل سکی۔ قاری صاحب مرحوم کا کمال یہ تھا کہ کتاب چاہے شرح جامی و شرح وقایہ ہو، یا منشورات و قطبی، جس فن کی جو کتاب پڑھانے بیٹھتے، ایسا لگتا کہ بس یہ اسی کے ماہر ہیں۔ بہترین مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطیب بھی تھے۔ جتنی دل نشین تقریر اتنی ہی دلکش تحریر، غبی سے غبی انسان بھی ان کی تقریر یا درس میں شریک ہو جائے تو کچھ لے کر ہی اٹھے۔ اپنے درسی اساتذہ میں حضرت مولانا محمد اسباط صاحبؒ کا نام بہ کثرت لیتے،

جنہوں نے امام اہل سنتؒ کے استاذ بزرگوار حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب (شارح میبذی) کے قائم فرمودہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دونوں جگہ تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔ اور ان کے نامور و بافیض شاگردوں میں غالباً حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ بھی شامل تھے۔ آخر میں نابینا ہوجانے کے باوجود ان کا فیضان علم جاری رہا۔ اور میں نے اپنے لائق اعتماد بڑوں سے سنا کہ حضرت مولانا محمد اسباط صاحبؒ اس حال میں بھی اپنے استاذ محترم حضرت امام اہل سنتؒ سے ملاقات اور ان سے علمی استفادہ کے لئے ان کی قیام گاہ دارالمبلغین میں آیا کرتے تھے۔

میرے استاذ محترم حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنویؒ حضرت امام اہل سنتؒ کے بھی نہ صرف قابل اعتبار شاگرد تھے، بلکہ انہوں نے ایک بھونرے کی طرح امام اہل سنتؒ کے گلدستہ علم و معرفت سے عرق کشید کیا تھا۔ ابتدائی دور میں کچھ عرصہ بسلسلہ ملازمت سلطان پور میں قیام کے بعد پھر تادم آخر اپنے استاذ و مربی کے ادارہ دارالمبلغین سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ بڑی تعداد میں لوگ ان کو بھی امام اہل سنتؒ کے صلبی فرزندوں ہی میں شمار کرتے تھے۔ مدرسہ اور تحریک مدح صحابہؓ ہی میں نہیں، ہمارے گھریلو معاملات اور نجی مسائل میں بھی وہ اس طرح شریک و سہیم رہتے کہ متعدد بار میں نے خود اپنے والد ماجدؒ اور اپنے بڑے ابّا حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ کو اپنی اولاد کی شادی بیاہ و دیگر نجی امور کے سلسلہ میں بھی ان سے مشورہ کرتے دیکھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ استاذ محترم قاری

محمد صدیق صاحب لکھنوی بھی گویا ہمارے کنبہ کے افراد ہی میں سے تھے۔

قاری صاحب کے علاوہ میرے یہاں ایک دوسرے اہم استاذ حضرت مولانا ولی محمد خاں صاحب سیتاپوری بھی تھے، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دارالمبلغین میں اس کے نصاب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور وہ امام اہل سنتؒ، نیز ان کے فرزند گرامی حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ بہت لائق اور قابل استاذ، لیکن تھے تو بہرحال خاں صاحب!۔ اور باوجود خصوصی شفقت و رعایت کے اس ''خان صاحبی'' کی ہلکی پھلکی جھلک (جو ضرب سے نیچے نیچے ہوتی تھی) کبھی کبھی مجھ پر بھی ظاہر ہوجاتی تھی۔

اس ''خان صاحبی کی جھلک'' کے دو واقعے یاد رہ گئے۔ ان میں سے ایک تو اسی دور طالب علمی کا ہے کہ مدرسہ میں ایک نئے اور اس وقت کے جوان رعنا استاذ مولانا مختار احمد ندوی صاحب کا تقرر ہوا۔ وہ چوں کہ ''ندوی'' تھے، اس لئے عربی ادب و لغات کے سلسلہ میں اپنے کو فائق و ممتاز سمجھتے تھے۔ مدرسہ کے دوسرے دو استاذ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ اور صدر المدرسین حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ تو ان کے قد سے بہت بلند تھے، اس لئے ان کے نشانہ پر اکثر ہمارے استاذ حضرت مولانا ولی محمد صاحبؒ ہی رہا کرتے تھے۔ جو ان سے سینئر بھی تھے، اور کسی بھی لحاظ سے ان سے کم نہ تھے۔ مگر بہ ہرحال وہ قاسمی تھے ندوی نہیں! اس لئے ان دونوں کے درمیان عربی ادب و لغات کو لے کر ہلکی پھلکی و بےضرر نوک جھونک چلا کرتی

تھی۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ کسی عربی لفظ (جو مجھے یاد نہیں رہ گیا) کے اردو ترجمہ کے سلسلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ مولانا مختار احمد صاحب اس کا ترجمہ رائتہ بتا رہے تھے، جب کہ مولانا ولی محمد صاحب دہی —— پھر دونوں نے اپنا اپنا ترجمہ کئی مرتبہ تاکید کے لئے دوہرایا۔ وہ منظر یاد ہے کہ مولانا مختار صاحب تو مسکرا مسکرا کر رائتہ رائتہ کہہ رہے تھے۔ جب کہ مولانا ولی محمد صاحب کی ''خان صاجی والی رگ'' بھڑک اٹھی تھی، اور وہ خشمگیں انداز میں باآواز بلند دہی دہی کی رٹ لگائے ہوئے تھے —— اس ''حسین منظر'' کو ہم لوگوں نے برسوں یاد رکھا، اور دونوں کی آوازوں کی نقلیں اتار کر رائتہ رائتہ اور دہی دہی دوہراتے رہے۔

دوسرا واقعہ اس وقت کا ہے جب میں اپنے مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ سے وابستہ ہوکر کافی عرصہ سے اپنے فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔ اور حضرت مولانا ولی محمد صاحبؒ نے بھی اپنے وطن سیتاپور واپس جا کر ایک مدرسہ قائم کرلیا تھا۔ میری ایک عزیزہ کا رشتہ مولانا کے مدرسہ کے ایک استاذ کے ساتھ آیا جو مولانا کے بہت معتمد تھے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہوجائے، جس کے لئے انہوں نے مجھ سے تعاون مانگا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں اپنی ان عزیزہ کے گھر والوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے ''ہماری ہندوستانی کفاءت کی بناپر'' اس رشتہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کیوں کہ ان کا تعلق خاندان سادات سے تھا، جب کہ مولانا کے مجوزہ استاذ صاحب کی رشتہ داریاں خان صاحبان میں بھی تھیں۔ مجھے چوں کہ انکار کی اس بنیاد سے

بالکلیہ اتفاق نہیں تھا، اس لئے کچھ جھنجھلاہٹ کے عالم میں لڑکی والوں کی طرف سے انکار، اور ''وجہ انکار'' کو یہ سوچے بغیر کہ خود مولانا بھی ''خان صاحب'' ہیں، اپنے ایک خط میں لکھ کر مولانا کو بھیج دیا —— بس پھر کیا تھا، رشتہ اور رشتے کی بات چیت تو ہوگئی پیچھے، مولانا کی ''رگ خاں صاحبی'' بھڑک اٹھی۔ اور جواب میں انہوں نے اپنے غیض وغضب کا اظہار کرنے کے لئے مجھے جو خط لکھا، اس میں کچھ اس طرح کے الفاظ بھی تھے کہ

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ لکھنؤ کے فاروقی صاحبان کا نسبی معیار کتنا بلند ہے کہ انہیں خان صاحبان بھی اپنے برابر کے نظر نہیں آتے''

یوں تو مولانا کو مجھ سے ناراض ہونے اور اپنی برہمی کا ہر طرح اظہار کرنے کا حق تھا، لیکن مجھے یقین ہے کہ درج بالا الفاظ انہوں نے اپنی ''خاں صاحب کی حالت'' میں لکھے ہوں گے۔ ورنہ انہیں مجھ سے اور مجھ سے کہیں بڑھ کر میرے آباء واجداد سے جو محبت تھی، اس کو ملحوظ رکھ کر وہ کبھی یہ الفاظ لکھ کر مجھے نہ بھیجتے —— مگر بات پھر وہی کہ ہمارے مولانا تھے تو آخر ''خان صاحب!'' اللہ کا کرم ہے کہ اس واقعہ کے بعد بھی مولانا مرحوم کی شفقتیں و کرم فرمائیاں مجھے حاصل رہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے یہ استاذ محترم مجھ سے خوش ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

فرحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

اسی مدرسہ کے دور طالب علمی سے میرا اور مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب کا درسی ساتھ شروع ہوا، جو اگرچہ میرے عم زاد ہونے کی وجہ سے مجھ

سے تین برس بڑے بھائی تھے، لیکن ہماری اب تک کی تعلیم الگ الگ مدرسوں میں ہوئی تھی۔ انہوں نے حفظ وقرأت کی تکمیل مدرسہ عالیہ فرقانیہ سے کی تھی، اور میں نے مدرسہ تجوید الفرقان سے۔ اس لئے ہمارے درمیان برادرانہ رشتہ تھا، دوستانہ نہیں! —— یہ رشتہ تو درسی ساتھی ہونے پر یہاں سے دارالعلوم دیوبند تک، اور پھر اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک اس طرح چلا کہ ہم نے ''برادرانہ رشتہ'' کو جیسے فراموش ہی کر دیا تھا —— جو بہ ہر حال ایک حقیقت کے روپ میں طویل وقفہ کے بعد ہی سہی، سامنے آ کر رہا۔ اور اب بفضلہ تعالیٰ ہم دونوں آپس میں بھائی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ بہ ہر حال وہ ہم سے ''تین برس بڑے ہیں''؟۔ لیکن اس احساس کے ساتھ کہ ؎

ہے ''عشق گریزاں'' کی طرح دل میں تری یاد
شعلے پہ یہ سیماب ٹھہرتا بھی نہیں ہے

ہاں یہ ذکر تو رہ گیا کہ اس مدرسہ میں میں نے اپنے بڑے ابا اور مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحب سے بھی پڑھا، ہمارے بڑے ابا مرحوم کو دیکھنے اور برتنے والے جانتے ہیں کہ وہ علم وعمل میں فائق، اور اپنے پدر بزرگوار حضرت امام اہل سنتؒ کے صحیح ومعتبر جانشین ہونے کے باوجود مزاجاً بہت مستغنی قسم کے انسان تھے۔ کسی قسم کی پابندی کو نہ قبول کرنے والے بے دھڑک، بے باک اور جری —— یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اسباق کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ جب، جس دن، اور جتنی دیر تک موڈ میں ہوتے پڑھاتے، اور خوب پڑھاتے تھے۔ ہم ان سے عربی نثر ونظم کی

کتابیں ''مجانی الادب'' اور ''ازہار العرب'' پڑھتے تھے۔ جو وہ بہت مزے لے لے کر پڑھاتے اور ہم بھی مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔

روایتی طور پر ہمارے خاندان میں چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان ادب ولحاظ کے بڑے فاصلے ہوا کرتے تھے۔ جس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ میرے والد ماجد نے اپنے بڑے بھائی کے روبرو نہ کبھی مجھ سے بات کی نہ ہی وہ ان سے میرا کوئی ذکر کر سکتے تھے۔ اسی طرح بڑے بھائی کی ''جا و بے جا'' سننے اور خندہ پیشانی کے ساتھ کسی ملال کے بغیر برداشت کرنے کے متعدد واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں —— تاہم ایک عجیب بات یہ تھی کہ بڑے ابا مولانا محمد عبدالسلام کی انتہائی بارعب اور باوزن شخصیت ہونے، اور والد ماجد کے ان سے اس طرح مرعوب رہنے کے باوجود میں ان کے سامنے کبھی کبھی اتنا جری ہو جاتا تھا، جس کا والد صاحبؒ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں پورے یقین اور ہوش وحواس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یقیناً یہ جرأت بھی بڑے ابا مرحوم ہی عطا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی منہ لگا کر مجھ سے ایسی بات یا ایسے سوال کرتے جس کے جواب میں میں ان سے ایسی باتیں کر لیتا جسے کبھی اگر والد صاحب سنتے تو مجھے گستاخ کہتے ہوئے آئندہ ایسی بات کرنے سے منع کرتے۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ میرے بڑے ابا تو میری اس ''گستاخی'' پر خاموش ہو جایا کرتے تھے، بلکہ وہ تو مجھے اس پر آمادہ بھی کرتے تھے۔ پھر بھلا میں کیوں کر اس ''جرأت وگستاخی'' کو ترک کرتا؟

تَغَمَّدَ اللّٰہُ بِغُفْرَانِہٖ،

بات پھر وہی کہ میری بکھری ہوئی کتاب زندگی کا یہ وہی حصہ زیر قلم ہے جو مجھے ''یاد رہ گیا'' اور جس میں سے اکثر کا میرے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ مولانا عبدالعلیم صاحب کے ''دور دوستی'' کے وہ چند خطوط اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں جو وہ مجھے سہارن پور سے لکھا کرتے تھے، جب کہ وہ مظاہر علوم سہارن پور میں اور میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور تقریباً ہر ہفتہ ملاقات یقینی ہونے کے باوجود ہمارے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ ہر دن وہ میرے نام اور میں ان کے نام خط ضرور لکھیں گے۔ اور اس اپچ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی کبھی دو دو، تین تین دن کے لکھے ہوئے خطوط مجھے ایک ساتھ ڈاک سے ملا کرتے تھے۔ اور میں ہر خط کا ایک ایک لفظ بڑے اشتیاق وانہماک کے ساتھ پڑھا کرتا تھا —— غالباً کچھ ایسا ہی معاملہ ان کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا؟ —— ''جو یاد رہ گیا'' اور ''جو بھول گیا'' کے اسی کھیل کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ میں نے اپنی داستان زندگی کے اس حصہ کو پہلے قلم بند کر دیا جو اس حصہ کی تحریر سے آگے کا ہے، کیوں کہ اس وقت ''جو یاد آگیا'' یہ سوچ کر لکھ دیا کہ کہیں یہ بھی ''جو بھول گیا'' کی نذر نہ ہو جائے۔ اس لئے ممکن ہے کہ کچھ باتوں کی تکرار ہو گئی ہو؟ مگر میں اب اس میں کوئی قطع و برید نہیں کروں گا —— جو لکھ گیا وہ لکھ گیا۔

کون کسی کے کام آنے والی یہ پھیکی و بے رنگ داستان زندگی ہے؟ یہ تو

بس اپنے دل کی تسلی کے لئے ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے کچھ ادھر ہی کی اور باتیں بھی ضبط تحریر میں لے آنا مناسب ہے، جو اس وقت یاد آ رہی ہیں؟۔

آج کے لحاظ سے میرے بچپن کا دور بہت عجیب وغریب تھا۔ بس گھر سے مدرسہ، اور مدرسہ سے گھر، یا زیادہ سے زیادہ محلہ کے اعزہ واقارب کے گھروں تک اپنے گھر کے بڑوں سے بتا کر جانا، نہ باہری دوستوں کا کوئی حلقہ نہ سیر سپاٹے اور برگر و پزہ کی ضیافتیں، آؤٹنگ اور سینما بینی تو دور، نخاس اور چوک بازار سے آگے کسی بڑے بازار تک بھی رسائی نہیں —— اور یہ سب کچھ جبری طور پر نہیں، بلکہ میرے جیسے تمام بچوں کا کم وبیش یہی حال تھا۔ البتہ ''مولوی گھرانہ'' سے وابستہ ہونے کی وجہ سے میرا اپنے والدین یا دوسرے بڑوں کے ساتھ ''آؤٹنگ'' پر جانے کا بھی کوئی تصور نہ تھا۔ ماحول کچھ ایسا تھا کہ کسی محرومی کا بھی احساس نہ تھا۔ ہم بس اپنی دنیا ہی کو پوری دنیا سمجھتے تھے اور اسی میں مگن رہتے تھے —— اس بیچ اگر کبھی ''خلاف معمول وزٹ'' ہو جاتی تو پوچھئے مت کہ کیسی اچھل کود ہوتی؟۔ جیسے ایک مرتبہ میرے ایک رشتہ کے ماموں بنارس سے آئے۔ بہت خوش مزاج اور ہم بچوں کے لئے بہت پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے کئی روزہ قیام کے دوران ایک دن ہم سے مخاطب ہو کر بولے کہ یہاں ''کملا سرکس'' لگا ہے۔ دیکھنے چلو گے؟ ہم نے یہ سمجھے بوجھے بغیر کہ سرکس کیا ہوتا ہے؟، صرف ماموں کے ساتھ باہر گھومنے جانے کے شوق میں ہامی بھر لی —— اور پھر والدہ صاحبہ کو ہموار کر کے وہ اسی دن شام کے وقت ہم کو سرکس دکھانے لے گئے، جو ہمارے محلہ کے

قریب ہی ایک پارک میں لگا ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ سرکس اور اس کے کرتب دیکھ کر اتنا مزہ آیا کہ ہم لوگ مہینوں سرکس کے بونے، موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے، اور رسی پر چلنے والی لڑکیوں کا ذکر کرتے رہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ کاکوری کے آبائی مکان میں چند روزہ قیام کے دوران زاہد علی (گھر کے پرانے خدمت گار) کے ساتھ کاکوری کا میلہ دیکھنے جانا، اور وہاں سے کچھ کھلونے خرید کر لانا بھی یاد ہے۔ کبھی کبھی والد صاحب دینی جلسوں یا دعوتوں میں بھی اپنے ساتھ لے جاتے، اور والدہ صاحبہ بڑے اہتمام کے ساتھ کپڑے بدلوا کر مجھے ان کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔

ہفتہ دو ہفتہ میں ایک بار اپنے مدرسہ تجوید الفرقان کے سامنے کے ایک میدان میں گیند کھیلنے کے لئے جانے کی اجازت بھی مل جاتی تھی۔ گھر میں رہ کر پتنگ بازی اور لوڈو کھیلنے کا شوق ضرور تھا، مگر والدہ کی طرف سے سخت پابندی ہونے کی وجہ سے ان سے چھپ چھپا کر ہی یہ شوق پورا ہو پاتا تھا۔

بچپن کی اس محدود سرگرمی کا یہ نتیجہ تو ظاہر ہونا ہی تھا کہ میں پڑھائی کے معاملہ میں اپنے ہم عمر بچوں سے ہمیشہ آگے ہی رہا۔ اور مدرسہ تجوید الفرقان لکھنؤ سے لے کر دار العلوم دیوبند تک ہر جگہ، اپنی جماعت کا سب سے کم عمر طالب علم میں ہی ہوتا تھا۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں پلنے بڑھنے کے باوجود آج بھی پرانے لکھنؤ کے چند محلوں کے سوا نہ شہر سے میری واقفیت ہے نہ میں اکیلا کسی سے پوچھے بغیر ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں۔ بلکہ شہر کے بیشتر نامی گرامی اور بڑے بازار ایسے ہیں جہاں سے میں نے کبھی

کوئی خریداری نہیں کی ہے۔ جیسے شہر کا قدیم اور معروف بازار حضرت گنج، جہاں سے گذر تو بار بار ہوا ہے لیکن اس بازار سے کوئی خریداری کرنا مجھے یاد نہیں ہے۔ اسی طرح لکھنؤ شہر کے بہت سے ایسے تاریخی مقامات جن کی سیر و سیاحت کے لئے ملک و بیرون ملک کے سیاح آتے ہیں، ان کی نہ میں نے سیر کی نہ ہی کبھی اس کا شوق ہوا؟۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے کہیں زیادہ میرے بچے اور مدرسہ کے طلبہ شہر لکھنؤ کے گلی، کوچوں اور بازار ہاٹ سے واقف ہیں۔ اور میری یہ ''افتاد طبع'' لکھنؤ ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ملک و بیرون ملک کے بہت سے مقامات پر جانے کا موقع ملا، مگر وہاں کی ''سیر سپاٹوں کی جگہوں'' پر جانے کی طرف کبھی رغبت نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر ممبئی شہر خوب خوب جانا اور کئی کئی ہفتوں تک وہاں قیام کرنا ہوا۔ مگر نہ میں کبھی حاجی علی گیا، نہ مجھے اس کا علم ہے کہ جوہو، چوپاٹی اور انڈیا گیٹ جیسے مقامات کہاں ہیں؟ جب کہ ان کے ''نام اور کام'' کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ میں اپنے اس دور کی بات کر رہا ہوں جب بچے اپنے باپ چچا اور گھر کے دیگر بڑوں کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ ماں بہنوں کی یہ دھمکی ہی ''راہ راست'' پر لانے کے لئے کافی ہو جایا کرتی تھی کہ ''دیکھو اپنے ابّو (یا چچا وغیرہ) کو آنے دو، ان سے تمہاری شکایت کریں گے۔ میری والدہ مرحومہ ایسے موقعوں پر اپنے منجھلے بھائی (مولانا محمد عبد السلام صاحبؒ) کا نام لے کر اپنا کام نکال لیا کرتی تھیں۔ کیوں کہ میرے گھر میں والد صاحب کے سوا دوسرا کوئی مجھ سے بڑا مرد نہیں

تھا جس کے آنے کی وہ مجھے دھمکی دے پاتیں؟ اور والد صاحب اتنے نرم مزاج تھے کہ انہیں بچوں کو مارنا تو دور کی بات، ڈانٹنا بھی گوارہ نہ تھا۔ کبھی اگر والدہ کے اصرار پر وہ کسی بچے کو ڈانٹتے بھی تو اس طرح اپنی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے کہ والدہ صاحبہ ان کی اس ''ڈانٹ'' پر جھنجھلا کر کہہ دیتیں کہ ''رہنے دیجیئے آپ نہ ڈانٹئے''۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم لوگ والد صاحب سے زیادہ تو والدہ صاحبہ سے ہی ڈرتے تھے۔ اور یہ بھی ہوتا کہ والد صاحب کے گھر آنے پر والدہ صاحبہ کی ''سختی اور ظلم'' کی ان سے شکایت کرتے تھے، جس کے ازالہ کا وعدہ کر کے وہ ہمیں خوش کر دیا کرتے تھے۔

والد صاحب کے تعلق سے یہ بات بھی اور قابل ذکر ہے کہ ان کی اولاد میں غالباً میں وہ ''تنہا خوش نصیب'' تھا جس نے ایک مرتبہ ''اپنی سعادت مندی'' کے طفیل میں والد صاحب کے ہاتھ سے مار کھائی ورنہ ہمارے دوسرے بھائی بہن تو اس سے بھی ''محروم'' رہے۔ جب کہ بڑے ابا (منجھلے چچا) کا معاملہ بالکل الٹا تھا۔ ان کی شخصیت اتنی بارعب اور وزن دار تھی کہ انہیں دیکھتے ہی اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ وہ جب تک ہنس کر کوئی بات نہ کرتے، یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی بات پر ڈانٹ نہ دیں۔ ڈھیلا ڈھالا اور معمولی قسم کا لباس زیب تن کرنے کے باوجود ان کا بھرا بھرا چہرہ، گنجان داڑھی، اور بے تصنع گفتگو کا انداز ہی ایسا تھا کہ ان کا سامنا کرتے ہوئے بڑے بڑے سورماؤں کے پسینے چھوٹ جاتے تھے —— پھر ہم بچوں کے سروں پر چڑھے ہوئے شیطان کے لئے ان کا نام ہی لاحول کا کام کیوں نہ کرتا؟۔

وہ تو خیر ہمارے گھر گھرانے کے بڑے تھے۔ کسی بے جا شرارت پر ڈانٹ دینے کا اختیار تو محلہ کے ہر بڑے بوڑھے کو حاصل ہوتا تھا۔ اور مجال تھی کہ کوئی بچہ اپنے کسی بڑے کی ڈانٹ کو نظر انداز کر دیتا، یا اس کی شکایت اپنے گھر والوں سے کر پاتا؟ ''ڈبل ڈانٹ ڈپٹ'' سے بچنے کے لئے بچے اسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ گھر کے باہر کا معاملہ باہر ہی رفع دفع کر دیا جائے، اور اس کی اطلاع گھر والوں کو نہ ہو۔ ہم کو اپنے محلہ کے عبدالحمید (جو حمید بانکے کے نام سے مشہور تھے) نامی ایک بڑے تو اب بھی یاد آتے ہیں، جن کی ڈانٹ ڈپٹ سے محلہ کا شاید ہی کوئی لڑکا بچا ہو (یاد رہے کہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ لڑکوں ہی تک محدود تھی، وہ کسی لڑکی کو نہیں ڈانٹتے تھے، بلکہ باقاعدہ اس کی نگرانی کرتے تھے کہ کسی لڑکے کی ''ترچھی نگاہ'' کسی لڑکی پر نہ پڑنے پائے؟۔

کبھی اس سجے سجائے اور ''محدود ماحول'' کا موازنہ آج کے ''کھلے اور آزاد ماحول'' سے کرتا ہوں تو ایک عجیب احساس محرومی ہوتا ہے، اور اپنے محلہ کے وہ بڑے بہت یاد آتے ہیں جن کے دم سے بڑے چھوٹے کا ایک بھرم بھی قائم تھا اور وہ اپنے محلہ کے محافظ بھی ہوا کرتے تھے —— اب کہاں وہ پاس ولحاظ، اور اس کی برکتیں! اب تو بس یادیں ہی یادیں ہیں۔

میری پیدائش اگرچہ آبائی وطن کاکوری میں ہوئی۔ اور میں اپنے بھائی بہنوں میں آخری تھا۔ جس کی ولادت کاکوری میں ہوئی۔ میرے بعد کے میرے چار بھائی بہن سب کی پیدائش لکھنؤ شہر میں ہوئی۔ والدہ صاحبہ مجھے

چند ماہ کا لے کر مستقل طور پر لکھنؤ شہر سکونت کے لئے آگئی تھیں۔ اور پھر اس کے بعد کاکوری آنا جانا تو رہا، لیکن مستقل سکونت لکھنؤ ہی کی رہی۔

لکھنؤ اپنی زبان و تہذیب کی وجہ سے اپنے ملک ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں اپنی ایک خصوصی شناخت رکھنے والا شہر ہے، لیکن یہ کہنا برحق ہے کہ دھیرے دھیرے لکھنؤ اپنی ''خصوصی شناخت'' کھوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہاں کی تاریخی عمارتیں، کھانے پینے کی کچھ مخصوص دکانیں، اور قدیم لکھنؤ کے چند معمر وشکستہ حال باشندے لکھنؤ کی عظمت رفتہ کے کچھ دھندلے دھندلے نقوش کی صورت میں نظر آجاتے ہیں۔ مگر اب وہ لکھنؤ کہاں جس کے بارے میں اس کے ایک شیدائی امیرؔ مینائی نے کہا تھا کہ ؎

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی ادائیں حور وغلماں میں
رہے گا یاد ہم کو خلد میں بھی لکھنؤ برسوں

مشہور مؤرخ عبدالحلیم شررؔ کی ''گذشتہ لکھنؤ'' والا شہر لکھنؤ تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن بچپن میں جو کچھ اور جیسا کچھ لکھنؤ میں نے دیکھ لیا، آج کے ماحول میں اس کا تصور بھی ایک ''خواب پریشاں'' ہی لگتا ہے۔ زبان وبیان، نشست وبرخاست، اور لباس ووضع قطع سے لے کر کھان پان، اور تفریحی مشاغل تک میں جو لکھنؤ میں نے دیکھ لیا، اس کا ذکر اب کتابوں ہی میں مل سکے گا؟۔

ویسے تو اسرار الحق مجازؔ نے کئی دہائی قبل ہی کہہ دیا تھا کہ ؎

پھر اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

لیکن مجازؔ کی ''صبح نو'' میں بھی ''شام غریبان لکھنؤ'' ختم نہیں ہوئی، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ''شام غریباں'' بھی دیکھی، اور ''صبح نگاراں'' بھی ـــــ یہ الگ بات ہے کہ وہ مجازؔ والی ''شام غریباں'' نہ رہی ہو؟

میرے بچپن کے لکھنؤ میں تین قسم کے سلام رائج تھے؟ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا تو ''السلام علیکم'' کہتا، کوئی ہندو دوسرے ہندو سے ملتا تو ''نمستے یا نمسکار'' کہتا۔ اور کوئی مسلمان کسی ہندو سے ملتا تو پہل جس طرف سے بھی ہو ''آداب عرض'' کہا جاتا تھا۔ یہ سلام ''غیر سیاسی'' ہوا کرتے تھے، جس میں مذہب کے ساتھ ساتھ ایک تہذیب کی عکاسی بھی ہوا کرتی تھی۔

لباس میں شیروانی، لکھنؤ کے پختہ عمر لوگوں کے تہذیبی لباس میں داخل تھی، جسے مسلم وغیر مسلم سب ہی استعمال کرتے تھے۔ اور پھر شیروانی کے ساتھ ٹوپی کا استعمال بھی لازمی ہوا کرتا تھا۔ شیروانی کے ساتھ پائجامہ پہنا جاتا تھا۔ جب کہ بعض دھوتی استعمال کرنے والے بزرگ شیروانی کے بجائے دھوتی کے ساتھ کوٹ پہنا کرتے تھے۔ کھانے پینے کے لئے فروخت ہونے والی اشیاء میں ایک قسم کی ندرت ہوا کرتی تھی۔ مثلاً گنّے کو باقاعدہ چھیل کر اس کے چھوٹے چھوٹے برابر سائز کے ٹکڑے کئے جاتے۔ پھر انہیں تھالی نما ایک ''جھلّی'' میں سجا کر رکھا جاتا۔ اور ان پر عرق گلاب یا کیوڑہ چھڑک کر درمیان درمیان کئی جگہ ان پر گلاب کے پھول رکھے جاتے ـــــ اور پھر اسے ''گنڈیری گلاب'' کی صدا لگا کر فروخت کیا جاتا۔

برسات کے موسم میں گلی گلی صدا لگا کر ''کھویا پٹّی'' بیچنے والے بھی رات

کے وقت آتے ، جن کا ہم بچے والہانہ استقبال کرتے ۔اور ہمارے طفیل میں گھر کے بڑے بھی لکھنؤ کی ’’خاص ڈش‘‘ کھویا پٹی سے لطف اندوز ہوتے ۔

یہاں کے تفریحی مشاغل میں یوں تو کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی بھی داخل تھی۔مگر ان ’’بازیوں‘‘ میں عام طور پر شرفاء دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ البتہ’’پتنگ بازی‘‘ میں شرفاء کی بھی دلچسپی ہوا کرتی تھی لیکن اس میں نوجوان زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ پختہ عمر کے لوگوں کا سب سے محبوب تفریحی مشغلہ ’’شطرنج‘‘ ہوا کرتا تھا، جس میں بسا اوقات ایسا انہماک ہوتا کہ لوگ کھانا پینا، سب بھول کر گھنٹوں ’’شطرنج‘‘ کھیلا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ ان تمام ’’تفریحی مشاغل‘‘ سے عام طور پر دین پسند لوگ احتراز کرتے تھے۔البتہ ہم طلبہ کو ’’تعلیمی تاش‘‘ کھیلنے کی اجازت ہوا کرتی تھی، جس میں حرف ’’ژ‘‘ کے استعمال کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ تعصب و تنگ نظری، رقص و سرود، پزہ و برگر، اور موبائل و انٹرنیٹ کی فراوانی کے اس دور میں وہ پرانا لکھنؤ بھی گم ہو کر رہ گیا ہے جسے میں نے بھی دیکھا اور برتا ہے۔اور جس کے بارے میں بڑے فخر کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ ؎

اظہارِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے
دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے

یوں تو تعلیم کے سلسلہ میں میرا پہلا سفر مئو شہر کا ہوا۔ جو ان دنوں ضلع اعظم گڑھ کا ایک قصبہ ہوا کرتا تھا۔ یہاں کے مدرسہ مفتاح العلوم میں والد صاحبؒ نے خود اپنے ساتھ لے جا کر میرا داخلہ کرایا تھا۔مگر کم عمری میں پہلی

مرتبہ ماں باپ اور گھر والوں سے چھوٹ کر اکیلے رہنا، اور لاڈ و پیار میں بگڑا ہوا وہ بچہ جو اپنی جگہ سے ہل کر پانی بھی نہیں پیتا تھا، مدرسہ کی خود پر منحصر (Self depended) زندگی کی تاب نہیں لا سکا، اور بس چند ماہ یا چند ہفتوں میں مدرسہ مفتاح العلوم سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پھر اسی جگہ واپس آ گیا جہاں سے گیا تھا۔

مدرسہ مفتاح العلوم میں میرے قیام کی مدت اتنی مختصر رہی کہ جب وہاں پر میرا داخلہ ہوا تو علم ہوا تھا کہ وہاں کے ایک بڑے استاذ حدیث (نام غالباً مولانا عبد الرشید صاحب تھا) حج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی حج سے واپس بھی نہیں آئے تھے کہ میری اپنے وطن واپسی ہو گئی، اور پھر مولانا موصوف کو دیکھ ہی نہ سکا۔ البتہ وہاں کے چند درسی ساتھیوں کے (جن سے کسی نہ کسی درجہ میں دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا تھا) نام اب بھی یاد ہیں ـــــ نام ہی کیا؟ اس قدیم رشتہ کی حلاوت کے ساتھ ان سے بفضلہ تعالیٰ آج بھی روابط ہیں۔ ان میں کا پہلا نام مولانا حافظ عبد الحئی صاحب خیر آبادی کا ہے، جو آج کل اپنے وطن کے معروف و با فیض مدرسہ منبع العلوم کے ناظم، جمعیۃ علماء کے اہم ذمہ دار، اور اپنے ضلع کے با اثر و مؤقر علمائے دین میں سے ہیں۔ دوسرا نام وہیں کے مولانا ڈاکٹر زین الحق صاحب کا ہے، جو اب مولانا کے بجائے ڈاکٹر کے نام سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ بہت دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اپنی وضع قطع سے ڈاکٹروں سے زیادہ مولویوں سے قریب ہیں۔ تیسرا نام اول الذکر کے

بھانجے مولانا محمد زبیر صاحب کا ہے، جو اپنی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر آج کل قابل رحم معذوری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دور طالب علمی سے تا ایں دم لاپرواہی کے ساتھ قہقہے بلند کرنے والے مولانا زبیر صاحب کو پیروں سے معذوری کے عالم میں چند برس قبل دیکھا تو بہت قلق ہوا۔ ؎۱

ایک اور ساتھی ضیاء الدین کی بھی کبھی کبھی یاد آتی ہے۔ جو محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیؒ کے نواسے تھے۔ لیکن دور طالب علمی کے بعد نہ ان سے کوئی رابطہ رہا، نہ ہی غالباً کبھی ملاقات ہوئی۔

مئو کے مقابلہ میں خیر آباد چوں کہ ایک چھوٹی آبادی کا گاؤں تھا (اور اب تو وہ ضلع مئو میں شامل ہے) اور پھر وہاں سے والد ماجدؒ، اور ان کے توسط سے میرے خصوصی روابط رہے۔ بسا اوقات دینی جلسوں میں بہ حیثیت مقرر شرکت کے لئے سال میں کئی کئی مرتبہ بھی جانا ہوتا۔ اس لئے وہاں کے عام چھوٹوں بڑوں سے پرخلوص و بے تکلف رشتے بنے رہے۔

مدرسہ مفتاح العلوم کے اول الذکر تین ساتھیوں سے ربط و رشتہ قائم رہنے میں اس چیز کا بڑا دخل رہا۔ ورنہ وہاں کے ساتھی تو اور بھی کئی تھے۔ جن کے اب نام بھی نہیں یاد رہ گئے۔

مصلحت کے تقاضے سے والد صاحب حصول تعلیم کے لئے میرے لکھنؤ

؎۱ آخر الذکر دونوں دوست (مولانا زین الحق اور مولانا زبیر صاحب) ہماری اس فانی دنیا سے اس تحریر کے بعد رخصت ہوکر راہی ملک بقا ہوئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

سے باہر رہنے کو ضروری سمجھ رہے تھے۔ اس لئے پہلے تجربہ کی ناکامی کے بعد اگلے تعلیمی سال میں انہوں نے میرا داخلہ بہرائچ شہر کے مدرسہ نور العلوم میں کرایا۔ جہاں ''جی لگانے'' کی بھرپور کوشش کی وجہ سے میرا جی لگ گیا۔ اور اس تعلیمی سال کے اختتام تک میں نے وہیں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ یوں بہرائچ بہ نسبت مئو ہمارے شہر لکھنؤ سے نزدیک بھی تھا۔ جس کی وجہ سے بہرائچ کے ۹-۱۰ ماہ کے قیام کے دوران متعدد مرتبہ اپنے گھر آنا بھی ہوا۔ اور والد صاحبؒ کی خصوصی محبت و توجہ سے والدہ صاحبہؒ کے ہاتھوں کے بنے ہوئے کھانوں کے بھی لطف لیتا رہا۔ پھر یہاں کے متعدد اساتذہ و ذمہ داران سے والد صاحبؒ کے گہرے روابط کی وجہ سے ان کی شفقتیں و محبتیں بھی حاصل رہیں اور ان کی سرپرستی و توجہات کے طفیل پڑھائی کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونے کی توفیق بھی ملی۔ جس کے فوائد و ثمرات دار العلوم دیوبند اور اس کے بعد کی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آئے — اور یوں میں کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی اصطلاح کے مطابق بہرائچ کے مدرسہ نور العلوم میں میرا داخلہ میرے لئے Turning Point ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان اساتذہ و سرپرستوں کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

نور العلوم کے بعد اگلے تعلیمی سال میں میرا داخلہ ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں ہوا۔ جہاں سے تین سالہ قیام کے بعد جیسی تیسی تعلیم کی تکمیل کر کے شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۰ء میں میری لکھنؤ واپسی ہوگئی۔

فالحمد للہ علیٰ نعمائہ الشاملۃ

ایک طلسماتی شخصیت
(مولانا) پالن حقانی مرحوم

یادش بخیر! آج زیر قلم ایک ایسی ''طلسماتی شخصیت'' کا ذکر ہے، جنہیں جاننے والے اور ان پر پروانہ وار فدا ہونے والے بھی فراموش کر چکے ہوں گے؟۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ یہاں کون کس کو سدا یاد رکھتا ہے؟ کیا خوب کہا ہے ڈاکٹر سلام سندیلوی مرحوم نے کہ

یہی ہے رسم دنیائے محبت ☆ کسی نے کب کسی کو یاد رکھا
گل مہر و وفا سے اس جہاں میں ☆ ہمیشہ کس نے دل آباد رکھا
کسی دن ایک ردی شی سمجھ کر ☆ اسے کھڑکی کے باہر پھینک دو گی
مری تصویر لے کر کیا کرو گی

یاد آ گئے اپنے وقت کے منفرد، نا قابل فہم، اور ''جاہل دینی خطیب'' (مولانا) پالن حقانی گجراتی مرحوم ـــــ انہیں ''مولانا'' لکھنا تو مجبوری ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے زور خطابت اور بے مثال قوت حفظ سے بڑے بڑے مولاناؤں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا ـــــ اور ''جاہل''

اس لئے کہ وہ خود اپنے ہی بیان کے مطابق بالکل جاہل تھے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن مجید بھی دیکھ کر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اپنی تقریروں میں وہ قرآن مجید کی کسی آیۃ کا ترجمہ سورہ، رکوع، اور آیت کریمہ کے بالکل درست حوالہ کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ عام طور پر بڑے سے بڑے حافظ قرآن بھی کسی آیۃ کے لئے ایسا تفصیلی حوالہ نہیں پیش کر سکتے تھے۔ مگر لطف یہ تھا کہ وہ جس آیۃ کا ترجمہ با حوالہ پیش کرتے تھے، اس کی درست تلفظ اور صحیح مخارج کے ساتھ تلاوت کرنے سے قاصر تھے۔ اگر کبھی ایسی نوبت آ ہی جاتی کہ وہ قرآن مجید کی کسی آیۃ کی تلاوت پر مجبور ہوتے تو ان کی تلاوت سن کر ہر قرآن مجید سے تعلق رکھنے والا مضطرب و بے چین ہو جاتا، اور کانوں میں انگلیاں ٹھوس کر یہی دعا کرنے پر مجبور ہوتا کہ اللہ تعالیٰ جلد سے جلد یہ سلسلہ ختم فرما کر ہمیں اس ''عذاب سماعت'' سے اور پڑھنے والے کو ''عذاب قرأت'' سے نجات دے۔

یہی حال دوران تقریر احادیث مبارکہ کے حوالوں کا ہوتا کہ کسی ایک مضمون کی حدیث کے لئے صحاح ستہ، و دیگر کتب حدیث کے ابواب وفصول، اور حدیث نمبر کے حوالوں کے ساتھ ترجمہ پیش کرتے۔ مگر الفاظ حدیث کی قرأت نہیں کر سکتے تھے۔ تمام حوالہ جات اتنے صحیح و درست ہوتے کہ اپنوں و ''بیگانوں'' سب نے بہت زور مارا، مگر کسی حوالہ کی کوئی ادنیٰ غلطی کبھی نہ نکال سکے۔ اور بہ قول استاد ذوقؔ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ان کی اپنی پچھلی ذاتی زندگی کے احوال خود ان ہی کے بیان کے مطابق کچھ اس طرح ہیں کہ وہ ایک قوال تھے۔ ان کی ماں ڈاکو تھیں۔ ان کی پیدائش جیل میں ہوئی تھی۔ ایک ڈاکو کے گھر میں علم اور تعلیم، خصوصاً دینی تعلیم وتربیت، اور روزہ نماز جیسی عبادات کا کیا ذکر؟ ان کی آواز اچھی تھی، اس لئے قوالی اور قوالوں کی دنیا میں مقبول ومشہور تھے۔

زندگی اسی ڈگر پر چل رہی تھی کہ اس میں دنیا کی آسودگی تو میسر تھی، مگر دین سے کوئی مطلب وواسطہ نہ تھا، نہ مرنے کا خیال آیا، نہ مرنے کے بعد کے انجام کی کوئی فکر تھی۔ اسی حال میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا ——— کسی مقام پر انہوں نے ایک ناتواں، خستہ حال، اور انتہائی ضعیف العمر بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ وہ اپنے سامنے پلیٹ میں رکھی ہوئی کھچڑی کھانے کی کوشش کر رہا ہے، مگر نوالہ اس کے منھ تک جاتے جاتے چند دانے ہی رہ جاتے۔ اس کے منھ سے رال ٹپک ٹپک کر اسی کھچڑی میں شامل ہو رہی تھی۔ انہیں اس کے اس حال زار پر ترس آیا، اور انہوں نے اس کے قریب پہنچ کر چاہا کہ اسے اپنے ہاتھ سے کھچڑی کھلا دیں۔ بوڑھے نے شکر گذاری کے ساتھ ایک آدھ لقمے ان کے ہاتھ سے کھانے کے بعد ان سے اصرار شروع کر دیا کہ اس میں سے تم بھی کھاؤ۔ انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی تو بوڑھے نے ناراض ہو کر خود بھی کھانا بند کر دیا۔ ان کی پریشانی یہ کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ بوڑھے کی ڈھیروں رال کھچڑی میں مل چکی ہے۔ اس کے کھانے کے تصور ہی سے انہیں ابکائی آ رہی تھی۔ مگر بوڑھے کا اصرار کہ یہی کھاؤ۔ اور

پھر بوڑھے نے ایک مرتبہ تیور بدل کر بہت رعب دار انداز میں کہا کہ ''کھالے، فائدہ میں رہے گا، ورنہ پچھتائے گا'' حقانی صاحب کا بیان ہے کہ بوڑھے کے اس طرح ڈپٹنے سے میں سہم گیا۔ اور پھر دو چار لقمے اس کھچڑی میں سے کھا ہی لئے۔ میں نے تو یہ سوچ کر یہ لقمے کھائے تھے کہ قے کر کے سب نکال دوں گا، مگر ہوا یہ کہ کھچڑی کے یہ چند لقمے کھاتے ہی میرے دل کی دنیا زیروزبر ہونے لگی ——— میں گھبرا کر اس جگہ سے چلا گیا مگر دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ اب مجھے قوالی اور اس کی محفلوں سے بیزاری ہونے لگی، اور میں نے ایسی محفلوں میں شرکت ترک کر دی۔

کوئی یقین کرے یا نہ کرے، مگر حقیقت یہی ہے کہ اس کے بعد سے میرے دل ودماغ کے دریچے کھل گئے۔ قرآن واحادیث کے مضامین مجھ پر القا ہونے لگے۔ میں نے جیسے تیسے دوسروں سے نماز پڑھنا سیکھا، اور پابندی کے ساتھ نماز روزہ کرنے لگا۔ بدعات وخرافات کی نفرت، اور سنت رسول کی محبت غیر ارادی طور پر میرے رگ وپے میں سرایت کرتی رہی۔

میں اپنے اوپر القا ہونے والے قرآن وحدیث کے ان مضامین کو اپنے قریبی دوست احباب کے سامنے بیان کرنے لگا۔ کسی نے اصرار کیا تو کوئی مضمون یا حوالہ بول کر اس کو لکھوا دیا۔ یہ سلسلہ کچھ اتنا بڑھا کہ میں باقاعدہ دینی جلسوں میں مقرر وخطیب کی حیثیت سے مدعو کیا جانے لگا۔ اور لوگ میری باتوں کو شوق وتوجہ کے ساتھ سننے لگے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اور کیسے ہو رہا ہے؟۔ میں خود بھی اور کچھ بھی نہیں

بتا سکتا ہوں ـــ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اللہ چاہے تو تنکوں سے پہاڑوں کے ہٹوانے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں سے ہاتھیوں اور ہاتھی والوں کی ہلاکت کا سامان کرسکتا ہے۔ **وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** ۔

بات کتنی صحیح اور کتنی غلط ہے؟ اس کا صحیح حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کم وبیش چوتھائی صدی تک دلوں پر راج کر کے حقانی صاحب زندہ رہے اور اب غالباً ایک عشرہ ان کے اس دنیا سے کوچ کئے ہوئے بھی ہو گیا ـــ کسی طرف سے ان کے اس بیان کی تردید میں کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔ تو پھر کیوں نہ ان ہی کی بات کا یقین کیا جائے؟۔

مجھے حقانی صاحب کی ذاتی زندگی کے سلسلہ میں ان کے اپنے اس بیان کے علاوہ بس اتنا ہی علم ہے کہ وہ صوبہ گجرات کے ضلع پالن پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباء واجداد اور ان کی اولاد واحفاد کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ البتہ یہ میرا چشم دید ہے کہ لکھنؤ اور کانپور سے لے کر ممبئی تک ان کا بیان سننے کے لئے لوگ پروانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے۔ اپنی اس ستّر برس سے اوپر کی عمر میں میں نے اللہ کے کرم سے ملک کے بڑے بڑے اور نامور خطباء کے بیانات سنے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی صاحبؒ، حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوری، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب شاہ جہاں پوریؒ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ، حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ، استاذ محترم مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنویؒ، اور اپنے

خاندانی بزرگوں میں حضرت مولانا محمد عبدالسلام فاروقیؒ، والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم فاروقیؒ، برادر معظم حضرت مولانا محمد عبدالاول فاروقیؒ، اور صاحبانِ معرفت وارشاد میں حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئیؒ، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ، نیز جداگانہ رنگ وآہنگ میں بیان کرنے والوں میں حضرت مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی، اور مولانا نظر محمد صاحب ناظر بہرائچیؒ، وغیرہم کے اصلاحی وحکمت بار بیانات سننے کی بار بار توفیق ملی۔ ان کی عوامی مقبولیت کے مناظر بھی نگاہوں کے سامنے آئے ـــ مگر بلا کسی خوف تردید یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حقانی صاحب مرحوم جیسی عوامی مقبولیت کہیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ وہ جہاں جاتے وہاں کے منتظمین کا ہر انتظام ناکافی ہوجاتا۔ بیٹھنے کا فرشی انتظام ہونے کے باوجود شامیانے اور قناتیں کھول کر بچھانے کی نوبت آجاتی، اس کے باوجود کھڑے ہو کر سننے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہوتی کہ بیٹھنے والے دور سے نظر نہیں آتے تھے۔ حقانی صاحبؒ کے بیان کی اپنی کچھ مقرر کردہ پابندیاں تھیں۔ وہ اپنا لاؤڈ اسپیکر اور اس کو فٹ کرنے والے افراد اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے، کیوں کہ دوسروں کے لاؤڈ اسپیکر پر ان کو اعتماد نہیں ہوتا تھا۔ ان کی ہر تقریر عموماً دو گھنٹے کی ہوتی۔ جس کے لئے موسم اور مقام کے لحاظ سے وہ خود وقت مقرر کر دیتے تھے، تقریر کا آغاز وہ ایک طویل خطبہ سے کرتے اور تقریر شروع کرنے سے پہلے یہ شعر بہت لہک کر اور سر تال کے ساتھ ضرور پڑھتے کہ ؎

اے ابر کرم ذرا تھم کے برس، اتنا نہ برس کہ وہ آ نہ سکیں

جب وہ آجائیں تو جم کے برس، اتنا برس کے وہ جا نہ سکیں

اکثر موڈ میں ہوتے تو ایک نعت

رحمت قسم خدا کی لٹی جا رہی ہے آج

پڑھ لو درود مومنو! پھر کیا کمی ہے آج

بھی پڑھا کرتے۔ اور پھر شروع ہوجاتی ان کی وہ تقریر جس کے لفظ لفظ کو سامعین پورے انہماک وتوجہ کے ساتھ سماعت کرتے۔ مجمع چاہے ہزاروں کا ہوتا یا ممبئ وغیرہ جیسے مقامات پر لاکھوں تک پہنچ جاتا۔ سناٹے کا یہ عالم ہوتا جیسے یہاں حقانی صاحبؒ کے علاوہ دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔

عموماً ان کا موضوع اتباع سنت ہوتا، اور اسی ذیل میں وہ بدعات وخرافات کی اس طرح تردید کرتے کہ اہل ہواوہوس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتیں۔ ممبئ اور کان پور میں تو انہوں نے اہل بدعت کی نہ جانے کتنی بڑی بڑی دوکانیں بند کرادیں۔ کان پور میں اہل سنت کے حلقہ میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں وقت مقرر کرکے ان کی ریکارڈ شدہ تقریروں کا ٹیپ باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر سنایا جاتا تو ہزاروں لوگ اسے سننے کے لئے جمع ہوجاتے۔

ایسی کئی خواتین نے جن کا تعلق لکھنؤ اور کان پور دونوں سے تھا۔ خود میرے گھر آکر بیان کیا کہ ہم لوگوں نے اپنے گھر کے مردوں سے صاف کہہ دیا ہے کہ کھانا مغرب سے قبل تیار ہوجائے گا، جن لوگوں کو کھانا ہے وہ مغرب تا عشا کھالیں۔ اس کے بعد ہم لوگ حقانی صاحبؒ کا بیان سننے جائیں گے۔

پھر جن لوگوں نے کھانا نہ کھایا ہوگا انہیں ہماری بیان سے واپسی کے بعد ہی مل سکے گا۔

ان کی اسی مقبولیت سے حواس باختہ ہوکر اہل بدعت نے انتظامیہ کے اعلیٰ افسران سے مل کر حقانی صاحبؒ کے کان پور داخلہ پر پابندی یہ تاثر دے کر لگوادی کہ ان کی تقریروں سے نقض امن کا خطرہ ہے — لیکن ان کی یہ تدبیر بھی اس طرح ناکام ہوگئی کہ کان پور کے مسلمانوں کے ایک مؤقر وفد نے اس وقت کے اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں صاحب سے ملاقات کرکے اور ان کے سامنے پوری صورت حال رکھ کر یہ پابندی بھی ہٹوادی۔ اور حقانی صاحبؒ کا بیان آزادانہ طور پر کان پور میں ہوتا رہا۔

حقانی صاحب اپنے بیان میں عموماً دو قسم کے حوالے دیتے تھے۔ ایک وہ جسے ''باصفحہ'' قرار دے کر قرآنی آیات، احادیث مبارکہ، اور اقوال سلف کو مکمل حوالوں کے ساتھ پیش کرتے۔ دوسرا وہ جسے وہ ''بےصفحہ'' قرار دے کر سامعین میں نشاط پیدا کرنے کے لئے لطائف وظرائف کی شکل میں پیش کرتے — دونوں کو پیش کرنے کا ان کا اپنا جداگانہ وامتیازی انداز ہوتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی ''بےصفحہ کی بات'' بھی افادیت سے خالی نہیں ہوتی تھی، اور اس میں بھی کوئی نہ کوئی سبق پوشیدہ ہوتا تھا۔

کم وبیش پندرہ برس ماہ محرم الحرام کے روایتی اصلاحی جلسوں میں شرکت کے لئے میرا ممبئ جانا ہوتا رہا۔ اس سلسلہ میں میرا آخری مرتبہ ممبئ جانا ۱۹۹۵ء میں ہوا تھا۔ کیوں کہ جون ۱۹۹۴ء میں والد ماجدؒ کی وفات کے بعد

اضافی ذمہ داریوں کی وجہ سے اتنے طویل عرصہ تک اس وقت کے حالات کی وجہ سے میرا لکھنؤ سے باہر رہنا دشوار تھا۔ ویسے تو میرا ممبئی جانا پیرولین، پٹھان باڑی (بھنڈی بازار) کے اس اسٹیج سے دس روزہ بیانات کے لئے ہوتا تھا، جو ہمارے اکابر کا پورے ممبئی شہر میں سب سے قدیم اور اہم اسٹیج تھا، جہاں سے مسلک حقہ کی ترویج واشاعت کا کام بہت بڑے اور مؤثر انداز میں ہوا۔ یہی وہ اسٹیج تھا جہاں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحبؒ اور ان کے برادر خرد اور میرے جدامجد جامع العلوم حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحبؒ، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ، نیز مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ اور حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوریؒ، اور آخر میں حضرت مولانا قاری وددوالحئیؒ صاحب ندویؒ کے بیانات ہوتے رہے تھے۔ اسی کے قریب امام باڑہ روڈ، کھڈے کی باڑی میں ایک دوسرا اہم اسٹیج بھی تھا، جہاں (مولانا) پالن حقانی صاحب کے اپنے روایتی مؤثر بیانات ہوتے تھے، اور یہاں ممبئی کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مجمع ہوتا تھا۔

حقانی صاحبؒ کے یہ بیانات میرے ممبئی پہنچنے سے پہلے سے ہو رہے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو میرے ممبئی کے ان جلسوں میں مقرر کی حیثیت سے جانے کا سلسلہ بھی حقانی صاحب کی وجہ سے ہی شروع ہوا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ چوں کہ حقانی صاحب کا اسٹیج ایک ایسے مقام پر تھا جو پوری ممبئی کے شیعوں کا مرکزی مقام تھا۔ مغل مسجد، امامیہ مسجد، اور دوسری شیعی عبادت گاہوں اور مرکزی مقامات ہی کی وجہ سے اس سڑک کا نام ''امام باڑہ روڈ'' پڑا۔ محرم کے

دس دنوں میں یہاں رات ودن شیعی مجالس کا سلسلہ رہتا۔ ایک مرکزی مجلس کو ہمارے لکھنؤ کے ایک شیعہ ذاکر صاحب خطاب کرتے تھے۔ وہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ اس روڈ کے آخری سرے پر دوسرے اسٹیج سے ہونے والی حقانی صاحب کی تقاریر کی رکارڈنگ کراتے، اور اگر اس میں انہیں ''اپنے مطلب کی کوئی بات'' مل جاتی تو وہ اسے ''اپنے لوگوں کی مجلس'' میں چٹخارے لے لے کر بیان کرتے، جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا، اور اپنوں میں ان کی قابلیت کی دھاگ جمتی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ حقانی صاحب کی تقاریر کا مرکزی موضوع ''اتباع سنت'' ہوا کرتا تھا، اور وہ چوں کہ کوئی عالم نہ تھے کہ ان کی تمام مشمولات پر نظر ہوتی، اس لئے ہزار خوبیوں کے باوجود ان سے نادانستہ طور پر کبھی کبھی چوک بھی ہو جاتی تھی —— ایسا ہی ایک بھیانک معاملہ اس وقت پیش آیا جب حقانی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں ''اتباع سنت'' پر زور دیتے ہوئے جوش بیان میں سنت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''کوئی پیر ہو فقیر ہو، عالم ہو فقیہ ہو، امام ہو یا صحابی ہو، سنت سے ایک قدم بھی جو ہٹے گا، اس کی پکڑ ہوگی۔ اور پھر انہوں نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ کچی بات بھی کہہ دی کہ ''خلفائے راشدینؓ'' میں سے پہلے دو ٹھیک ٹھیک سنت پر عمل کرتے رہے تو انہیں کامیابیاں ملتی رہیں۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ نے سنت کو چھوڑ کر اپنے اقرباء کو اہم سرکاری مناصب عطا کر دیئے تو ان کی پکڑ ہوگئی —— یہاں تک کہ انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، اور وہ بالآخر

باغیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے؟۔

یہ اتنی گھٹیا، سطحی، اور بے جوڑ بات تھی، جس نے ''امام باڑہ کے خطیب صاحب'' کے لئے ''ٹانک'' کا کام کیا——اور وہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کو بولے'' کو عنوان کلام بنا کر اپنی ''زہرافشانیاں'' کرنے لگے۔ ان کا انداز خطابت اس قدر دل آزار اور جارحانہ تھا کہ کسی غیرت مند مسلمان کے اندر اسے برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔ مجبوری یہ تھی کہ حقانی صاحب کی کہی ہوئی بات ٹیپ میں محفوظ تھی، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور ممبئی میں اس وقت کوئی ایسے سنی مسلمان عالم صاحب نہ تھے جن سے اس کی توقع کی جاتی کہ وہ حقانی صاحب کی اس ''خطائے کم علمی'' کی تصحیح کر کے ''چرب زبان حریف خطیب'' کی زبان بندی کا سامان کرسکتا۔ اور یہ بتاتا کہ نہ حضرت عثمان غنیؓ کا کوئی قدم سنت کے خلاف اٹھا، نہ ہی شہادت کوئی سزا ہے کہ جس پر طنز کیا جاسکے؟ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن ☆ نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اسی بیچ امام باڑہ روڈ کی ایک دوکان میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کرنے والے ایک ضعیف العمر، بیمار و ناتواں محب اصحابؓ و اہل بیتؓ جناب فضل واحد صاحب مرحوم کو کہیں سے یہ پتہ چلا کہ آج کل میں صوبہ گجرات کے شہر واپی میں بسلسلہ بیانات مقیم ہوں، تو وہ اپنی پیرانہ سالی اور علالت و ضعف کو بالائے طاق رکھ کر خاص مجھ سے ملاقات کے لئے ممبئی سے سفر کی مشقتیں برداشت کر کے مجھ سے واپی میں آکر ملے، اور میرے سامنے

پوری صورت حال رکھ کر باصرار مجھ سے کہا کہ آپ کو ہر حال میں ممبئی پہنچ کر اسی اسٹیج سے اپنی تقریر کے ذریعہ صحیح بات امت مسلمہ کے سامنے رکھنا ہوگی۔ یہ آپ کا دینی فریضہ بھی ہے، اور مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کی ذمہ داری کا تقاضا بھی——میں اس عالم ضعف و مرض میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، مجھے نامراد واپس نہ کیجئے گا۔

فضل واحد صاحب مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، مگر میں ان کے جوش ایمانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے ان کی تحسین و حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اپنا یہ عذر پیش کیا کہ ۱۰؍محرم تک میرا یہاں واپی میں رہنا ضروری ہے۔ یہاں بھی میں پہلی مرتبہ آیا ہوں اور ایک سلسلہ سے اپنی بات یہاں کے مسلمانوں کے سامنے رکھ رہا ہوں، جس کا نفع بھی نظر آرہا ہے، اور یہ سلسلہ دس محرم ہی کو مکمل ہوسکے گا۔ اس کے جواب میں فضل واحد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس ضابطہ کی پرمیشن تیرہ محرم تک ہوتی ہے۔ آپ ۱۱؍اور ۱۲؍محرم کی تاریخیں ہم کو دے دیجئے۔ ہم ممبئی واپس جاکر اس کا اعلان کردیں گے۔ اس طرح میرا پہلی مرتبہ ''کھڈے کی باڑی'' کے اسٹیج میں دو دن خطاب ہوا۔ اور میں نے ایک شعر ؎

ادھر آیا ستم گر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

کو عنوان کلام بنا کر خطاب کیا——پھر کیا کیا ہوا؟ اور کس کس طرح میری دوسرے دن کی تقریر کو پولیس فورس کی پوری طاقت کے ساتھ رکوانے کی

کوششیں ہوئیں؟ اور میں کس طرح اسٹیج پر پہنچا، اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود میری تقریر ہوئی؟ —— یہ ایک علیحدہ موضوع گفتگو ہے۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ میرے ان دو بیانات نے پوری فضا صاف کردی۔ اور صحیح صورت حال مدلل طور پر سامنے آجانے سے عام مسلمانوں خصوصاً فضل واحد صاحب مرحوم سے خوب خوب دعائیں ملیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور اس عاشق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واصحابؓ واہل بیتؓ نبی کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے جو اس ممبئی کے اسٹیج سے خطاب کا ذریعہ بنا۔ (آمین)

اس کے بعد پھر یہ ہوا کہ گلزار احمد اعظمی صاحب کی دعوت، اور حاجی نظام الدین عرف منا بھائیؒ، اور حاجی محمد الیاس صاحب بیکری والے کی خواہش واصرار پر اگلے سال سے میرے ممبئی کے اس اہم اسٹیج سے دس روزہ بیانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور جہاں اب تک مخدوم محترم حضرت مولانا قاری وددالحئی ندوی صاحبؒ کے بیانات ہورہے تھے،۔ اور اپنے ضعف وپیرانہ سالی کی وجہ سے انہوں نے ممبئی سے مستقل طور پر لکھنؤ منتقل ہونے کا ارادہ ظاہر کرکے آئندہ کے لئے ان جلسوں میں خطاب کرنے سے معذرت کرلی تھی۔

میرے ان بیانات کا سلسلہ کم وبیش پندرہ برسوں تک جاری رہا۔ پھر اس تعلق سے سانتا کروز، گوونڈی، ممبرا، کرلا، مدن پورہ، اور پھر وہاں سے بھیونڈی تک بیانات ہوئے۔ اور بسا اوقات پورا محرم کا مہینہ ممبئی اور اس کے مضافات میں ہی گذر جاتا۔

ممبئی کے اصل پیرولین والے اسٹیج سے بعد میں ایک سلسلہ میں نے یہ بھی شروع کردیا تھا کہ اپنے دس روزہ بیانات کے بعد ۱۱؍محرم کو ہمارے جو علمائے حق مختلف مقامات پر بیانات کے لئے آئے ہوئے ہوتے تھے، ان میں سے گلزار صاحب کے مشورہ سے میں ۴۔۵ علماء کو بلا کر اپنے اسٹیج سے ان کی تقریریں کراتا۔ اور ۱۲؍محرم کو نعت ومنقبت کا ایک مشاعرہ کراتا، جس میں ممبئی کے منتخب شعراء کرام کے علاوہ لکھنؤ، مالیگاؤں، اور بھیونڈی کے شعراء کرام کی بھی شرکت ہوتی۔ میری دعوت پر لکھنؤ سے اس مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعراء میں والی آسیؒ، ہمسر قادریؒ، رئیس الشاکریؒ، ایوب لکھنوی، رئیس انصاری، اور مولانا سراج احمد قمرؒ (فتح پوری) وغیرہم شامل تھے۔ ان کے علاوہ مالیگاؤں، بھیونڈی، اور خود ممبئی کے منتخب شعراء کرام کو گلزار صاحب دعوت دے کر بلاتے تھے۔

مجموعی طور پر ان جلسوں اور پھر مشاعرہ سے ممبئی میں ایک ایسی خوشگوار دینی فضا بن گئی تھی جسے ممبئی کے احباب اب تک یاد کرتے ہیں۔ لیکن ع

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

کئی برسوں کے تعطل اور پھیر بدل کے بعد اب گذشتہ چند برسوں سے میرے پیرولین کے اسٹیج سے میرے سعادت مند ولائق فرزند مفتی حارث عبدالرحیم قاسمی کے بیانات ہورہے ہیں۔ مگر اب نہ وہ پہلا سا شوق وجذبہ، نہ سامعین میں وہ طلب، اور نہ منتظمین میں وہ تڑپ۔ پھر بھی بفضلہٖ تعالیٰ خیر کا یہ سلسلہ جاری ہے اور بالواسطہ طور پر اس اسٹیج سے میرا رشتہ بھی باقی ہے۔

حقانی صاحبؒ کے تعلق سے یہ مختصر روداد اس لئے بیان کی گئی کہ میری کھڈے کی باڑی کی وہ پہلی دو روزہ تقریریں، جن کے تعلق سے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ حقانی صاحب مرحوم کی پیدا کردہ ایک غلط فہمی کے ازالہ کے لئے ان کی رد میں ہوئی تھیں، وہی دو تقریریں حقانی صاحب سے میرے رشتہ قائم ہونے کا ذریعہ بنیں۔

عام مزاجوں کے مطابق ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ حقانی صاحب مجھ سے ناراض ہو جاتے۔ اور وہ اپنی اس وقت کی عمومی مقبولیت کے دور میں میری باتوں کے الٹے سیدھے جوابات دے کر اپنے کو بالا کرنے کی سعی کرتے تو میری باتوں کا رنگ کچھ نہ کچھ ہلکا تو ضرور پڑتا۔ مگر یہ ان کے کمال اخلاص کی ایک علامت ہے کہ اپنی مقبولیت اور عمر ہر اعتبار سے مجھ سے کہیں بڑے ہوکر وہ خود چل کر میری قیام گاہ پر آئے، اور برملا اپنی لغزش کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوب خوب دعائیں دیں۔

اس کے بعد تو یہ ہوا کہ جب تک حقانی صاحب کے ممبئی کے ان بیانات کا سلسلہ رہا وہ برابر میری قیام گاہ پر آتے اور بسا اوقات کافی کافی دیر تک مجھے اپنی پر لطف و معلوماتی گفتگو سے مسرور و شاداں ہونے کا موقع فراہم کرتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ جہاں رہے، مبتدعین کے لئے دردسر بن کر رہے، ان کی تقاریر کا محور چوں کہ اتباع سنت ہوتا، اس لئے سنت کے خلاف اپنی من مانیوں کو دین بنا کر پیش کرنے والے اپنی دوکانوں کے ویران ہونے کے ڈر سے ان سے بے زار و خائف رہا کرتے۔ اس سلسلہ میں کان

پور کی سرگذشت کا ذکر آچکا ہے۔ اسی طرح کا ایک معاملہ ممبئی میں بھی پیش آیا جو بہت دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔

اس دوران جب ممبئی حقانی صاحب کی تقاریر کا مرکز تھا۔ اور دیگر مقامات کی طرح ممبئی کے مبتدعین بھی ان سے ہراساں و عاجز تھے۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا سفر ممبئی ہو گیا۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر ممبئی کے اہل بدعت علماء کا ایک نمائندہ وفد حضرت حکیم الاسلامؒ سے ان کی قیام گاہ پر آکر ملا۔ وفد میں شامل لوگوں نے ان سے حقانی صاحب کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ چوں کہ آپ دیوبندی علماء کے سرخیل و سربراہ ہیں، اور آپ کی اپنی ایک مؤقر شخصیت ہے۔ آپ کی بات تمام دیوبندیوں کے لئے قابل قبول ہوتی ہے۔ اس لئے آپ حقانی صاحب کو سمجھائیں کہ وہ ممبئی کی فضا کو خراب نہ کریں، اور ہمارے مسلک وعلماء کے خلاف اپنے جارحانہ حملوں کا سلسلہ بند کر دیں ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ اور پھر آپ حضرات کو بھی شکایت ہوگی، اور ان کی حمایت میں سامنے آجائیں گے۔ کیوں کہ وہ بھی دیوبندی ہیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے ان حضرات کی بات سن کر فرمایا کہ جہاں تک میرے علم میں ہے کہ حقانی صاحب تو صوبہ اتر پردیش کے نہیں، بلکہ گجرات کے ہیں۔ پھر ان کے دیوبندی ہونے کا کیا سوال ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ دیوبند کے باشندہ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے مسلک کے لحاظ سے دیوبندی ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں

ہے، نہ ہی انہوں نے دار العلوم میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ویسے اپنے آپ کو دیوبندی مسلک سے منسوب کرنے والے تو دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں۔ میرا ان پر کیا زور ہے؟ ارکان وفد نے کہا کہ یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے کہ وہ خود اپنے بیان کے مطابق بالکل جاہل ہیں۔ پھر بھی آپ کے دیوبندی مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تب تو اور بھی آپ کو ان پر لگام لگانا چاہئے۔ کیوں کہ وہ آپ حضرات کو بھی بدنام کر رہے ہیں ——— یہ سن کر حضرت حکیم الاسلامؒ نے مسکراتے ہوئے اپنے حکیمانہ انداز میں جو فرمایا، اس نے ان حضرات کو کھسیا کر خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ فرمایا کہ برسہابرس سے ہم نہ جانے آپ کے کتنے جاہلوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے ایک جاہل کو برداشت نہیں کر پا رہے ہیں، اور وہ آپ حضرات کی ناک میں دم کئے ہوئے ہے۔ اس طرح بڑی امیدیں لے کر آیا ہوا یہ وفد اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس آیا۔ اور حقانی صاحب کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے ذریعہ ممبئی کے ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح ہوئی، اور وہ بدعات و مراسم کو ترک کر کے پابند سنت ہوئے۔

ممبئی اور ملک کے دیگر مقامات پر حقانی صاحب کی تقاریر کا سلسلہ ان کی ضعیف العمری اور نقاہت کی وجہ سے قریب قریب ختم ہو چکا تھا کہ نہ جانے کن گھریلو حالات کی وجہ سے یہ سننے میں آیا کہ حقانی صاحب نے بڑھاپے کی عمر میں یوپی کے شہر فتح پور (ہنسوہ) کی کسی خاتون سے عقد ثانی کر لیا ہے، اور وہ اب ان ہی کے ساتھ فتح پور میں مقیم ہو گئے ہیں۔

فتح پور سے میرا کئی طرح کا قدیمی تعلق تھا۔ میری دو حقیقی پھوپھیوں کی شادیاں فتح پور ہی میں ہوئی تھیں، چھوٹی پھوپھی صاحبہ (اہلیہ مولانا محمد رفیق القاسمی صاحب) تو پھوپھا صاحب کی لکھنؤ کے سنی انٹر کالج میں ملازمت کی وجہ سے کچھ ہی عرصہ بعد سے لکھنؤ میں مقیم ہو گئیں۔ لیکن بڑی پھوپھی صاحبہ (اہلیہ قاری محمد ظہیر الاسلام صاحبؒ) اپنے سسرالی مکان فتح پور ہی میں قیام پذیر تھیں۔ پھر دادا صاحب اور والد صاحبؒ کی نسبت سے فتح پور کے دینی جلسوں میں شرکت کے لئے میرا برابر جانا ہوا کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں شرکت کے لئے فتح پور جانا ہوا تو پھوپھی صاحبہ کے مکان واقع محلہ خیلدار میں بیٹھا تھا کہ اچانک مجھے حقانی صاحب یاد آ گئے۔ میرے دریافت کرنے پر میرے کسی پھوپھی زاد بھائی نے بتایا کہ ان کا مکان تو میرے گھر سے بالکل قریب اسی محلہ میں ہے۔ اتنا سننا تھا کہ میری باچھیں کھل گئیں، اور میں فوراً بھائی کے ساتھ حقانی صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے گھر پہنچ گیا۔

کچھ دیر انتظار کے بعد حقانی صاحب سامنے آئے۔ برسوں کے بعد دیکھا تو مجھے ان کی حالت زار پر بہت ترس آیا۔ بڑھاپا پوری طرح حاوی، چال میں ڈگمگاہٹ، منھ سے دانت غائب، اور کان میں آلۂ سماعت لگا ہوا—— مگر باتوں میں وہی شگفتگی و شادابی۔ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے، اور چمٹ جانے کے انداز میں معانقہ کرنے کے بعد مجھے بٹھا کر پہلا سوال کیا کہ آپ تو سنی ہیں نا؟ میرے اثبات میں جواب دینے پر کہا تو پھر میری سنئے، اپنی سنانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ کان میں لگے آلۂ سماعت کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ یہ نمائشی اور رعب ڈالنے کے لئے ہے —— ورنہ میں ان حدوں سے باہر جا چکا ہوں۔ چیخ چیخ کر اپنا گلا خراب نہ کیجئے گا۔ بس میری سنتے رہئے گا۔ پھر کچھ دیر میری ان سے ''انٹرنیشنل لنگویج'' یعنی میری طرف سے اشاروں اور ان کی طرف سے زبانی گفتگو ہوتی رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال میرے لئے ناقابل تصور تھی۔ میرے چہرہ پر اکتاہٹ کے آثار دیکھ کر حقانی صاحب کی رگ ظرافت بھڑک اٹھی —— اور پھر انہوں نے کہا

اچھا جاتے جاتے ایک ''بے صفحہ'' کی سنتے جایئے۔ ایک بزرگ کے پاس اچانک ملک الموت آگئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ میرا وقت موعود آ گیا ہے۔ تب انہوں نے فرشتہ سے کہا کہ میں چلنے کے لئے تیار ہوں، بس دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت چاہتا ہوں۔ یہ سن کر ملک الموت نے کہا، میں آپ کو لے جانے کے لئے نہیں آیا ہوں، میں آپ کے پڑوسی کو لینے آیا ہوں۔ سوچا کہ آپ سے ملاقات کرتا چلوں۔

یہ سن کر وہ بزرگ بہت خوش اور مطمئن ہوئے۔ پھر انہوں نے ملک الموت سے کہا کہ اگر آخری مرتبہ آنے سے پہلے اسی طرح آپ کا ایک آدھ مرتبہ پہلے آنا بھی ہو جایا کرے تو لوگوں کے دلوں سے آپ کی وحشت ختم ہو جائے گی۔ جواب میں ملک الموت نے کہا کہ ''یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے ذمہ کتنا بڑا کام ہے؟'' ایک ہی وقت میں کہاں کہاں اور کن کن لوگوں تک پہنچ کر اپنا کام کرنے کے حکم کی مجھے تعمیل کرنا پڑتی ہے؟ وہ تو بس

ہمارے اور آپ کے رب کی دی ہوئی طاقت ہے کہ ان کے حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے —— اتنے مصروف ''شیڈول'' میں اس کی کہاں گنجائش کہ میں بار بار ہر ہر جاندار کے پاس جا سکوں، تاہم آپ کا معاملہ دوسرا ہے، آپ سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آخری مرتبہ سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ تو آپ سے ملاقات کے لئے ضرور آؤں گا۔''

کچھ عرصہ کے بعد پھر ملک الموت صاحب ان بزرگ کے پاس آئے تو انہوں نے یہ سمجھ کر کہ حسب وعدہ ملک الموت صاحب مجھ سے ملاقات کے لئے آگئے ہیں۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کا استقبال کرتے ہوئے اپنے خدام کو چائے پانی کے انتظام کا حکم دیا، جسے سن کر ملک الموت صاحب نے کہا ''اب چائے پانی کی زحمت کیا کیجئے گا، وہیں چل کر جو چاہے کھایئے پیجئے گا۔ ہم آپ کو لینے کے لئے ہی آئے ہیں۔

اتنا سنتے ہی ان بزرگ صاحب کو جلال آ گیا، اور انہوں نے بے بسی کے ساتھ کہا کہ ہو گا تو وہی جس کا آپ کو حکم ملا ہے۔ مگر آپ نے جو کچھ کیا وہ آپ کے لئے زیبا نہ تھا۔ آپ فرشتے اور وعدہ خلافی جھوٹ، آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آخری مرتبہ سے پہلے کم از کم ایک مرتبہ ضرور آئیں گے۔ مگر یہ کیا؟ کیا یہ دھوکا دھڑی نہیں ہے؟

بزرگ کی یہ پھٹکار سن کر فرشتے نے کہا کہ جھوٹ اور دھوکا دھڑی تو آپ انسانوں کے بیچ ہوتی ہے، ہم تو معصوم فرشتے ہیں، ہمیں کیا معلوم کہ یہ سب کیا ہے اور کیسے ہوتا ہے؟۔ رہ گیا میرے وعدہ کا معاملہ، تو میں حسب

وعدہ آپ کے پاس کئی مرتبہ پہلے بھی آیا، مگر آپ ہی نے مجھے نہیں پہچانا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ — میں جب آتا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا ہوں۔ میرے آنے کا ثبوت یہ ہے کہ ایک مرتبہ آیا تو آپ کی سماعت لے گیا، پھر آیا تو آپ کے دانت لے گیا، اس کے باوجود آپ کہہ رہے ہیں کہ میں آیا ہی نہیں۔ میں تو آیا مگر آپ نے مجھے پہچانا ہی نہیں — اب آپ ہی بتائیں کہ قصور کس کا ہے؟''

بے صفحہ کا یہ من گڑھت لطیفہ سنانے کے بعد حقانی صاحب نے کہا کہ ''دیکھئے صاحب! میرے پاس بھی ملک الموت کی آمد و رفت شروع ہوگئی ہے۔ آپ میرا حال دیکھ ہی رہے ہیں، پیٹ میں آنت تو ہے، مگر منہ میں دانت نہیں ہے۔ جیسی تیسی بصارت تو ہے، مگر سماعت بالکل ختم ہو چکی ہے —— یعنی ملک الموت صاحب اپنا کام شروع کر چکے ہیں۔ اب کسی دن آپ یہ بھی سن لیں گے کہ ملک الموت حقانی کو بھی لے گئے —— اور پھر واقعی یہی ہوا کہ یہی ملاقات میرے لئے اس دنیا میں حقانی صاحب سے آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ چوں کہ وہ پھر فتح پور سے اپنے وطن گجرات منتقل ہو گئے تھے، اور ان کی وفات بھی وہیں ہوئی، اس لئے کافی وقت گذر جانے کے بعد ہی مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اللہ بس —— باقی ہوس

یہ دنیا عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ دل بینا ہو تو امام شافعیؒ کو انڈے میں اللہ کے وجود کا ثبوت مل گیا، جو دو الگ الگ قسم کے سیال مادوں (لیکوڈ)

کو ایک چھوٹے سے خول میں کسی جھلی یا حجاب کے بغیر بھی ایک کو دوسرے سے الگ رکھتا ہے — اور یہ اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے، ورنہ انسان کے بس میں یہ کہاں؟

اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ (میں نے اپنے پروردگار کو اپنے مضبوط ترین ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) یعنی کوئی انسان خود اپنے لئے کسی کام کا پختہ ارادہ کرے، لیکن عین وقت پر کوئی ایسی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے منصوبہ اور ارادہ کے باوجود وہ کام نہیں کر پاتا —— اس سے علم ہوا کہ ہماری اپنی ذات پر بھی کسی بلند و بالا ہستی کا کنٹرول ہے کہ اس کے چاہے بغیر ہم اپنا طے کیا ہوا کام خود بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی حقیقت حال یہ ہے کہ ؎

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیران ہوں ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

اس کے باوجود ہم غفلت کوش لوگ اپنے خالق و مالک کی نافرمانیوں سے باز نہیں آتے۔

میں نے یہ سمجھا کہ حقانی صاحب کی طلسماتی و کرشماتی شخصیت بھی عجائبات خداوندی میں کا ایک عجوبہ ہی تھی کہ ان جیسی کمالات و خصوصیات کی حامل کوئی دوسری شخصیت مجھے دیکھنے کو نہ مل سکی۔ حق تعالیٰ مرحوم کی حسنات کو قبول فرما کر اپنی شایان رحمت اس کا صلہ عطا فرمائے، اور ان کی سیئات سے اپنی شان مغفرت کے مطابق درگذر فرمائے۔ (آمین)

ایک بڑا خسارہ

۲۷/جون ۲۰۲۳ء کی تاریخ نہ صرف میرے اور میرے کنبہ کے لئے، بلکہ مسلمانان لکھنؤ کے ایک بڑے حلقہ کے لئے غم واندوہ کا پیغام لے کر آئی، جب میرے چھوٹے بھائی، دارالعلوم فاروقیہ کاکوری کے صدرالمدرسین اور ''سنی مجلس عمل'' نامی تنظیم کے صدر مولانا عبدالولی فاروقی نے کینسر جیسے موذی مرض سے نہایت ہی صبر وحوصلہ کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے لکھنؤ کے فہمینہ ہاسپٹل میں زندگی کی بازی ہار کر اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو سوگوار کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

برادرم عبدالولی مرحوم کی ولادت کو ہمارے کنبہ میں جد امجد حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی دعاؤں کا خصوصی ثمرہ سمجھا گیا۔ کیوں کہ اپنی وفات کے سال ۱۹۵۶ء میں یا اس سے پہلے کے سال میں انہوں نے اپنے آخری حج کے موقع پر کعبۃ اللہ سے لپٹ چمٹ کر اپنے اکلوتے فرزند (والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ) کے لئے ایک اور فرزند کی پیدائش کی دعا مانگی تھی، اور اپنی اس دعا کی قبولیت کا انہیں اس درجہ یقین تھا کہ سفر حج سے واپسی پر اپنے کنبہ کے افراد کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے حرم

الٰہی میں بنائے ابراہیمی کعبۃ اللہ سے لپٹ کر عبدالحلیم کے لئے کم از کم ایک اور فرزند کی دعا مانگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ عبدالحلیم کو فرزند عطا کرے گا۔ اگر یہ بچہ میری موت کے بعد پیدا ہو تو اس کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ میرا نام جوڑ کر ''ابراہیم عبدالرحیم'' رکھنا۔ چنانچہ دادا صاحب کی وفات کے بعد جب عبدالولی کی ولادت ہوئی تو دادا صاحب کی وصیت کے مطابق ان کا نام ''ابراہیم عبدالرحیم'' ہی رکھا گیا، اور اسی نام پر ان کا عقیقہ ہوا۔ آج بھی ہم لوگوں کے رہائشی مکان کا نام ''ابراہیم منزل'' ہے۔ چوں کہ اس وقت تک ہمارے خاندان کے (ہمارے جد اعلیٰ مولوی حافظ شاہ محمد ناظر علیؒ کی اولاد) کے لڑکوں کے نام ''عبد'' کی اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات میں سے کسی کی طرف اضافت کر کے ہی رکھے جا رہے تھے، اس لئے ہمارے بڑے دادا حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے میرے نومولود بھائی کا عرفی نام میرے نام عبدالعلی کا ہم وزن عبدالولی رکھا۔ اور پھر اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی۔

عبدالولی مجھ سے عمر میں آٹھ سال چھوٹے تھے۔ ان کے بعد مجھے اللہ تعالیٰ نے عبدالکریم اور عبدالوحید نامی دو بھائی اور بھی عطا کئے۔ ابتدائی عمروں میں آٹھ برس کا فاصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ جب میں نے ۱۹۷۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے بیس برس سے بھی کچھ کم عمر میں سند فراغ حاصل کی تو عبدالولی لکھنؤ کے مدرسہ تجوید الفرقان میں حفظ کر رہے تھے۔ پھر اسی سال ان کے اور خود میرے استاذ جناب حافظ سید علی صاحبؒ کی وفات

ہوجانے سے ان کو والد صاحبؒ نے اپنے قائم فرمودہ مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ میں منتقل کردیا، جہاں سے ایک برس بعد ۱۹۷۱ء میں مدرسہ کے پہلے جلسۂ دستار بندی میں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، حضرت مولانا نور محمد صاحب ٹانڈوی، حضرت مولانا قاری سید وودالحئی ندوی ودیگر اکابر کے ہاتھوں اپنے دیگر پانچ ساتھیوں کے ساتھ (جس میں خاندان کی ایک کم عمر ۸ رسالہ حافظہ بچی ام عمارہ مرحومہ بھی شامل تھی) دستار بندی ہوئی۔ پھر اسی مدرسہ میں ۱۹۷۸ء تک انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق اس وقت کے موقوف علیہ تام یعنی مشکوۃ شریف وغیرہ کی جماعت تک تعلیم حاصل کی، اس دوران انہوں نے اتر پردیش عربی وفارسی بورڈ کے امتحانات مولوی تا فاضل بھی پاس کرلئے، پھر تعلیمی سال ۷۹-۱۹۷۸ء میں ان کا داخلہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند میں کرایا گیا، جہاں سے ۱۹۷۹ء میں انہوں نے فراغت حاصل کی۔ اسی سال شوال کے مہینے میں نیا تعلیمی سال شروع ہونے پر ان کا تقرر دارالعلوم فاروقیہ کاکوری میں درجات عربی وفارسی کے استاذ کی حیثیت سے ہوگیا، جہاں سے بہ تدریج ترقی کرتے ہوئے ان کی وابستگی قائم رہی اور وفات کے وقت وہ اپنی مادر علمی میں صدرالمدرسین کے منصب پر فائز تھے۔

عبدالولی مرحوم سے میرا ایک رشتہ جسمانی تو تھا ہی، اسی کے ساتھ وہ میرے شاگرد، میری ماتحتی میں کام کرنے والے مدرس، اور مدرسہ سے لے کر تحریک مدح صحابہؓ تک میرے ایسے معاون تھے کہ انہوں نے یکسوئی کے

ساتھ مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے تدریسی، تحریری، تقریری وتصنیفی مشاغل کے لئے فارغ کردیا تھا۔ مدرسہ سے متعلق کوئی بیرونی سرکاری معاملہ ہو یا تحریک ومشن سے متعلق کوئی معاملہ ہو، ہر جگہ ان کی موجودگی میرے لئے باعث تقویت تھی۔ انہوں نے اپنی تنظیم ''سنی مجلس عمل'' کے بینر تلے عوامی خدمت کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا تھا کہ بہت بڑی تعداد میں عوام ان کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ حکومت اور اس کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران میں ان کے رسوخ سے بہت بڑے بڑے اور پیچیدہ کام چٹکیاں بجاتے ہوجایا کرتے تھے۔ اپنے خاص مزاج اور افتادِ طبع کی وجہ سے جوں جوں وہ عوام اور تحریک میں آگے بڑھتے گئے، میں اپنے کو پیچھے کرکے اپنے پسندیدہ دیگر علمی ودینی مشاغل میں منہمک ہوتا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ماہنامہ ''البدر'' کے بلا مبالغہ ہزاروں صفحات کے ساتھ ہی ایک درجن سے زائد مستقل تصانیف کی اشاعت کے مواقع ملتے رہے۔ عبدالولی کی حکام رسی اور عوامی مقبولیت بہ حیثیت بڑے بھائی میرے لئے قابل فخر بھی تھی اور بنائے اعزاز بھی۔ ان کے اس طرح دنیا سے رخصت ہونے سے جیسے میرا بازو ٹوٹ گیا۔ پیرانہ سالی کی اس عمر میں جب ان کی مجھے ہی نہیں بہتوں کو شدید ضرورت تھی، ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہی پڑا، کیوں کہ حقیقت یہی ہے کہ

''مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ''۔

اللہ کے دین کا کام کسی شخصیت پر منحصر نہیں ہوتا۔ جب اللہ کے چہیتے اور آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو حضرت

عمر فاروقؓ جیسے مدبر و فرزانہ صحابی اسی فکر کی وجہ سے دماغی توازن کھو کر ننگی تلوار لئے یہی صدا لگا رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر ہمارا اور ہمارے دین کا کیا ہوگا؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم اس دنیا میں نبی کے بغیر رہیں۔ مگر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یہی ارشاد فرما کر حضرت عمرؓ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو ہوش کے ناخن لینے پر مجبور کیا تھا کہ **مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّهُ حَيٌّ لَا يَمُوتُ**۔ (یعنی جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معبود سمجھ کر ان کی عبادت کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ ان کے معبود محمدؐ کی موت واقع ہوگئی اور جو کوئی (محمدؐ کی رہنمائی سے) اللہ کی عبادت کرتا تھا، وہ سمجھ لے کہ اللہ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آسکتی ہے) ایسے میں ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عبدالولی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی وجہ سے دین کا کوئی کام بند ہو جائے گا۔ یقینی طور پر اللہ تعالیٰ اپنے دین کا کام لینے کے لئے افراد پیدا کرتا رہے گا، اور دین کا کارواں صبح قیامت تک یوں ہی رواں دواں رہے گا —— لیکن ہنستے مسکراتے چہرے، اپنی نرم خوئی، اور اپنی بارسوخ ملّی قیادت کی وجہ سے عبدالولی بہت دنوں تک یاد کئے جاتے رہیں گے۔

؎

دل میں یادِ غمِ بیکراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

حق تعالیٰ ان کی سیئات سے درگذر فرما کر اور ان کی حسنات کو شرف قبول بخش کر انہیں کروٹ کروٹ آرام عطا فرمائے۔ (آمین)

اس کتاب کی تکمیل اور تقریباً پوری کتابت کے بعد یہ سانحہ پیش آیا، اس لئے اپنی زندگی سے وابستہ اس سانحہ کا بھی مختصراً ہی سہی، ذکر ضروری تھا۔ یقیناً وہ وقت بھی آنا ہے جب راقم الحروف کے بارے میں بھی شاید کوئی نیک دل بندہ ایسی ہی کوئی تحریر قلم بند کرنے پر مجبور ہو۔

یہ بھی ہونا تھا ---؟

۱۴؍شوال ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۴؍اپریل ۲۰۲۴ء روز بدھ کو علی الصباح میرے عم زاد بھائی، میرے رفیق درس، اور سب سے بڑھ کر میری شعوری زندگی کے کم و بیش ۶۰؍برسوں کے ہم راز و دم ساز اور اکثر کے شریک کار مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب بھی دنیائے فانی سے منھ موڑ کر راہی ملک بقا ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ابھی میرے حقیقی چھوٹے بھائی عبدالولی کی وفات پر پورا سال بھی نہیں گذرا تھا کہ دس ماہ کے قلیل عرصہ کے اندر ہمارے خاندان، ہمارے مشن و تحریک، اور ہمارے عوام و خواص کو اس دوسری لائق اعتماد اور مرجع انام شخصیت کی جدائی کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا --- مگر حقیقت بہر حال یہی ہے کہ ''مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ''۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی اگرچہ مجھ سے عمر میں تین سال بڑے میرے بھائی تھے، مگر دوسروں کی طرح میں بھی انہیں اپنا بڑا اور قائد تسلیم کرتا تھا۔ اور یہ کسی مجبوری کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بانی تحریک مدح صحابہؓ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحبؒ کے حقیقی پوتے اور ان کے

جانشین تو وہی تھے۔ اس لئے ان کی تحریک و مشن سے وابستہ تمام لوگوں کے لئے مولانا عبدالعلیم صاحب کی حیثیت امیر کی تھی، اور اس لحاظ سے وہ ہمارے بھی امیر تھے۔

یہ الگ بات ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کا یہ چھوٹے بڑے کا رشتہ عوامی سطح پر تھا۔ نجی سطح پر ہم ایک دوسرے کے لئے وہی بے تکلف ''یار غار'' تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے مدرسوں سے حفظ کلام اللہ کی تکمیل کے بعد دارالمبلغین کے شعبہ درس نظامی جامعہ عربیہ خزینۃ العلوم میں عم محترم حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحب لکھنویؒ، حضرت مولانا ولی محمد خاں صاحب سیتاپوریؒ، اور حضرت مولانا مختار احمد صاحب ندویؒ سے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر ام المدارس دارالعلوم دیوبند تک ایک ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کی تھی، اور پھر دیوبند سے تکمیل تعلیم کے بعد اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ہم دونوں لکھنؤ واپس آکر وہ اپنی مادر علمی دارالمبلغین سے اور میں والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ کے اپنے وطن کاکوری میں قائم فرمودہ نو خیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ میں تدریس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جہاں سے ان کی اپنے ادارہ سے وابستگی بہ تدریج ترقی کے ساتھ تا دم واپسیں رہی اور میں بھی تا ایں دم اپنے ادارہ سے جیسے تیسے وابستہ ہوں ---- اور اب اس سے آگے بڑھ بھی کیا سکتا ہوں؟۔

ملک و بیرون ملک کے متعدد واقف کار حضرات کا اصرار ہے کہ مولانا

عبدالعلیم صاحب مرحوم کے سلسلہ میں میں بھی کچھ لکھوں، ایسے لوگوں کا خیال ہے اور میں بھی اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ بہت بچپن کی غیر شعوری عمر سے لے کر کم وبیش ٧٦ ربرس کی عمر میں مولانا مرحوم کی وفات تک مرحلہ وار انداز میں جتنا ہم دونوں کا ساتھ رہا اور جس جس طرح ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھا اور برتا، اب اس طرح ان کو سمجھنے اور ان کے احوال وکوائف کو پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ بیان کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ہر آدمی کی طرح مولانا عبدالعلیم صاحب مرحوم کی زندگی کے بھی دو پہلو تھے۔ ایک ان کی عوامی زندگی، دوسری ان کی نجی زندگی۔ ان کی عوامی زندگی کے سلسلہ میں اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں ان کی شخصیت اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے:۔

ان کے مداحین بھی اور ناقدین بھی، ان کے حاسدین بھی اور محبین بھی، ان کے واقعی مقربین بھی اور ان کی وفات کے بعد ان سے اپنا قریبی رشتہ بتا کر اپنا قد دراز کرنے کی کوشش کرنے والے بھی، ان کی وفات پر گھٹ گھٹ کر آنسو بہانے والے بھی اور ان کی وفات پر جشن منانے والے بھی —— غرضیکہ عوامی زندگی پر اظہار رائے کرنے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس میں غلط صحیح، حقیقی ومصنوعی، ہر قسم کی بات کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ''بعض فن کار'' نہ جاننے کے باوجود ''اپنی جان کاریوں'' کا اس وثوق واعتماد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ واقعی جان کار حیرت بداماں رہ جاتے ہیں۔

لیکن نجی زندگی کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس سے واقفیت بھی کم لوگوں کو ہوتی ہے، اور اس میں الٹ پھیر کرنے کی گنجائش بھی کم ہوتی ہے۔

اپنی اس تحریر میں مختصر طور پر میں مولانا مرحوم کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر گردان کر اپنے تجربات وواقفیت کی بنیاد پر کچھ حقائق بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

جہاں تک ان کی نجی زندگی کا معاملہ ہے تو سب سے پہلے اس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے بڑھ کر حقیقی، سچا اور جاں نثار ''کوئی دوست'' نہیں ہوا۔ جب تک ہم دونوں اس رشتے کو اس کے حقیقی رنگ کے ساتھ (جس کی مدت کم وبیش چالیس برس ضرور رہی ہوگی) نباہ سکے نباہا —— پھر جب احوال وکوائف، اور ''منصبی تقاضوں'' کی وجہ سے وہ قرب برقرار نہ رہ سکا، تو پھر ہم دونوں کی زندگیوں سے ''دوستی'' کا باب بھی حذف ہو گیا۔ یارانہ، برادرانہ، مساویانہ اور متفاوت درجات میں اپنے اپنے دائرہ کے لحاظ سے رشتے تو رہے، لیکن ''دوست'' کی حیثیت سے پھر کوئی دوسرا جگہ نہ بنا سکا۔ اسی لئے باحسرت ویاس یہی کہنے اور تا حیات کہتے رہنے پر مجبور ہوں کہ ؎

نظر نواز نظاروں میں جی نہیں لگتا
وہ کیا گئے کہ بہاروں میں جی نہیں لگتا

اس کے بعد سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ ان حضرت مولانا محمد عبدالسلام صاحبؒ کے فرزند تھے جو اپنی تمام تر علمی وشخصی وجاہتوں

کے باوجود مسجد میں جوتا تبدیل ہوجانے کے بعد بھی کئی دنوں تک ایک پیر میں لال اور دوسرے پیر میں کالا جوتا پہن کر بے تکلف جاتے آتے رہے، اور جو اپنے کرتے کے دامن میں سڑک سے گھر تک بسکٹ یا سبزی وغیرہ لے کر چلے جاتے تھے۔ اور وہ ان چچا حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ (میرے والد ماجد) کے بھتیجے تھے جو ایک بڑے وفد کے ساتھ قومی وملّی ضرورت کے تحت وقت کے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کے لئے جاتے ہوئے بہ مشکل تمام بہت اصرار کے بعد میلے کپڑے تبدیل کرنے پر تو راضی ہو گئے تھے، لیکن اصرار کے باوجود صدری تبدیل کرنے پر اس لئے تیار نہیں ہوئے تھے کہ جیبوں میں بھرے ہوئے مختلف انداز کے کاغذات کو سمجھ بوجھ کر دوسری صدری میں رکھنے کے لئے وقت میں گنجائش نہیں تھی۔ مولانا عبدالعلیم صاحب بھی اپنے بڑوں کی طرح ایسے متواضع اور بے تکلف زندگی گذارنے والے تھے کہ نہ ہٹو بچو کا اہتمام، نہ فٹ پاتھ پر لگی ہوئی سبزی کی دوکان سے سامان خرید لینے میں کوئی عار و جھجک۔ نہ ملنے جلنے ملاقات کے لئے کوئی مقررہ اوقات، نہ ''پرائیویٹ سکریٹری'' قسم کی کوئی لت، نہ سیکورٹی گارڈ، اور نہ ہی کوئی تحفظات کا اہتمام۔

رہ گیا ان کی عوامی زندگی اور دائرۂ خدمت کا معاملہ، تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کو وراثت اور دوسری کو حصول یابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یعنی ان کا سب سے بڑا، موروثی، اور لائق فخر تعارف تو یہ تھا کہ وہ

اپنے جد امجد امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۹۷۳ء میں وفات کے بعد جانشین بنے، اور نصف صدی سے زائد جانشین امام اہل سنت کی حیثیت سے رہ کر اس عالی وقار منصب کی نہ صرف بھرپور لاج رکھی بلکہ امام اہل سنت کے مشن کو ملک و بیرون ملک تک اتنے طاقت ور اور مؤثر انداز میں پہنچایا کہ پوری دنیا میں ان کی اور ان کے کارناموں کی دھوم مچ گئی۔

مولانا عبدالعلیم صاحب مرحوم نے اس سلسلہ میں اپنے بہترین وسائل کا استعمال کیا۔ ملک و بیرون ملک کے علماء و اکابر سے مضبوط رابطے قائم کئے اور انہیں حضرت امام اہل سنتؒ کے مشن اور ان کی تحریک سے روشناس کرا کے ان کے حلقہ ہائے اثر میں اس مبارک مشن کو پہنچایا۔ اور تقریروں و تحریروں کے ذریعہ اس مشن کی اہمیت و افادیت کی تائیدیں کروائیں۔ اس کی مثال کے لئے صرف اپنے ملک میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب علیہ الرحمۃ کی کتاب ''ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت'' نیز مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''دو متضاد تصویریں'' کو پیش کیا جا سکتا ہے، جس کا اول الذکر نے اپنی اس کتاب میں فراخ دلانہ انداز میں اعتراف بھی کیا ہے۔

جہاں تک ان کی ''عوامی زندگی'' کا معاملہ ہے تو سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کی ''حصول یابیوں'' سے میں خود بھی پوری طرح واقف نہیں رہا اور بہت سی چیزوں کا علم شدہ شدہ ان کی وفات کے بعد ہو رہا

ہے ---- وجہ اس کی یہ رہی کہ جانشین امام اہل سنت کی حیثیت سے ان کی تحریکی زندگی، اور پھر اس سے الگ ہٹ کر ان کی دیگر دینی وملّی سرگرمیوں میں میرا ساتھ بہت قلیل عرصہ تک ہی رہ سکا، اور کم وبیش گذشتہ تیس برسوں کی ان کی جہد مسلسل، ملک وبیرون ملک کے اسفار، تعلقات کی وسعت، جلوس مدح صحابہؓ کی حصول یابی، جمعیۃ علمائے ہند سے ان کی مختلف ادوار میں مختلف انداز سے وابستگی وغیرہ جیسے ان کی کتاب زندگی کے اوراق سے میں اتنا بے خبر وناواقف رہا یا رکھا گیا کہ نہ جانے کتنے مفاد پرست وخود غرض ان کے ''مقرب'' بن گئے۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ تو ایسا بھی آیا کہ ان ''مفاد پرستوں اور ابن الوقت لوگوں'' نے یہ تک باور کرانے کی سعی ناکام بھی کر ڈالی کہ میں ''امام اہل سنت کے مبارک مشن'' ہی کا مخالف ہوں ---- حالاں کہ ''فاصلوں کی کھینچی گئی لکیر'' کے باوجود خود مولانا عبدالعلیم صاحب مرحوم اس سے پوری طرح باخبر تھے کہ حبّ اصحابؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ان ہی کی طرح میرے بھی خون یا آج کی اصطلاح کے مطابق ڈی-این-اے میں شامل ہے۔ مگر ''مصلحت وقت'' کے کچھ ایسے تقاضے تھے کہ وہ اس کا بہ بانگ دہل اعلان نہیں کر سکتے تھے۔

اس سلسلہ کا ایک قابل ذکر واقعہ اسی ''فاصلاتی دور'' کا قصبہ جرول ضلع بہرائچ سے تعلق رکھنے والا ہے، جہاں سے میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ کا خصوصی رشتہ تھا، اور انہوں نے خلفائے راشدینؓ کی مناسبت سے چار روزہ سالانہ جلسے قائم کئے تھے۔ جن میں میرے خاندان

کے بزرگوں اور پھر ہم لوگوں کے دور تک کے لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہیں کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے میں گیا۔ جلسہ بازار میں تھا اور میرے داعی ومیزبان غلام رسول پردھان صاحب مرحوم کا مکان جلسہ گاہ کے عقب میں تھا۔ میں نماز عشاء کی ادائیگی اور کچھ دیر استراحت کی غرض سے مذکورہ مکان چلا گیا کچھ ہی دیر بعد میرے کانوں میں ایک تقریر کی آواز آنے لگی، جس میں بڑے سلیقہ اور اہتمام کے ساتھ فضائل صحابہؓ بیان کئے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے میزبان سے دریافت کیا کہ یہ عالم صاحب کون ہیں جن کی اتنی اچھی تقریر ہو رہی ہے؟ میزبان نے بتایا کہ یہ کوئی عالم نہیں ہیں، بلکہ قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک تاجر ہیں۔ جن کی ہمارے قصبہ میں دوکان ہے۔ دینی ذوق ہے، آپ حضرات کی تقریریں بہت ذوق وشوق سے سنتے ہیں اور کبھی موقع مل جانے پر سنی اور پڑھی ہوئی چیزوں کو اس طرح بیان کر دیتے ہیں۔ اسلوب بیان اور سب سے بڑھ کر موضوع خطابت اتنا پرکشش ومبارک تھا کہ میں سب چھوڑ چھاڑ کر بہ عجلت تمام اسٹیج پر ان کی تقریر سننے کی غرض سے پہنچ گیا۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنی تقریر ختم کر دی اور میرے اصرار کے باوجود انہوں نے پھر تقریر نہیں کی۔ مگر میں نے ان کی زبان سے جو کچھ سنا تھا اس سے بہت متاثر ہوا تھا، اور میں نے اپنی تقریر کے دوران ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ لکھنؤ واپسی پر ایک دن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے مولانا عبدالعلیم صاحبؒ سے کچھ اس طرح کہا کہ ''صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب

اگر میں اپنے افرادِ خاندان یا اپنے وابستگان کی زبان سے سنتا ہوں تو میرا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یعنی یہ تو حضرات صحابہ کرامؓ کا ہمارے اوپر ایک قرض ہے جس کی ادائیگی کی اپنی اپنی بساط کے مطابق ہم کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ''کسی غیر متعلق'' شخص کی زبان سے فضائل صحابہؓ سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ شخص میرے ابوبکرؓ میرے عمرؓ میرے عثمانؓ و علیؓ وغیرہم کے فضائل بیان کر کے میرے اوپر احسان کر رہا ہے۔ اور ایسے شخص کی محبت بے ساختہ دل میں جگہ کر لیتی ہے —— مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری اس گفتگو کے دوران مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور پھر انہوں نے بڑے جوش اور اعتماد کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ ''یہ تمہاری غیرت ایمانی کی بات ہے اور ان شاء اللہ صحابہ کرامؓ کی یہ محبت تمہیں اس طرح جنت میں داخل کرے گی کہ صدیق اکبرؓ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اپنے ساتھ لے کر جنت میں داخل ہوں گے۔'' اس ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میرے مرحوم بھائی اور دوست کے رگ و پے میں کس طرح صحابہ کرامؓ کی محبت سرایت کئے ہوئے تھی۔ اور اسی کے پیشِ نظر میں کہتا ہوں کہ ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

مولانا کی وفات کے بعد ان کی زندگی کے آخری لمحات کا ایک مختصر ویڈیو دیکھنے کو ملا جس میں مولانا مرحوم کا پوتا ان کے قریب بیٹھا ہوا ہے، جس کے سامنے مولانا حضرت امام اہل سنت کی تفسیر کے مطابق ''آیۃ معیت'' مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ الخ کی اپنی نحیف آواز میں تلاوت کر رہے ہیں اور سننے میں یہ آیا کہ مولانا نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ میں جو آیۃ پڑھ رہا ہوں اس میں حق تعالیٰ نے خود صحابہ کرامؓ کی فضیلت و مرتبہ کو بیان کیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ وہ تو جانشین امام اہل سنت تھے ؎

یہ رتبہ بلند ملا، جس کو ملا مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یوں تو مولانا عبدالعلیم صاحبؒ کی کتاب زندگی کے روشن اوراق کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن ان کی عوامی زندگی اور دائرہ خدمت کے سلسلہ میں دو اہم باتوں کا اس مختصر تحریر میں بھی ذکر کر دینا ضروری ہے:۔

اول یہ کہ انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے دور کے قابل اعتماد علماء و مشائخ سے مضبوط روابط اور ان کی خدمت میں طالبانہ انداز میں حاضری دیتے رہنے کا التزام کیا اور ان کی رہنمائی و سرپرستی میں جمعیۃ علماء ہند، مجلس تحفظ ختم نبوت وغیرہ کے بینر تلے بہت اہم ملّی و سماجی خدمات انجام دیں (جن کی تفصیلات بیان کرنے کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں ہے)

دوم یہ کہ انہوں نے اپنے اصل مشن ''دین حق کی ترویج و اشاعت میں

صحابہ کرامؓ کی بے مثال قربانیوں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق انہیں ایمان وعمل کا نمونہ بنانے کی ضرورت واہمیت، نیز دین حق پر گامزن ہونے کے لئے صحابہ کرامؓ کی مکمل وبلاشرط اطاعت کی لازمیت'' کو اپنے اسٹیج سے لے کر ملک کے گوشے گوشے ہی نہیں، اس وسیع دنیا میں اتنی دور دور تک نہایت مؤثر وطاقتور انداز میں پہنچایا کہ بلاشبہ اس سلسلہ میں بفضل خداوہ اپنے اسلاف کرام پر سبقت لے گئے۔

مولانا مرحوم سے وابستہ میری طویل داستان حیات میں بہت سے گوشے ایسے ہیں جنہیں میں بیان نہیں کرسکتا۔ ان کی امانت سمجھ کر اپنی تنہائیوں میں انہیں یاد کر کے میں زندگی کی آخری سانس تک مسکراتا یا آنسو بہاتا رہوں گا۔ اور اپنے قارئین سے یہی کہہ کر رخصت ہونا مناسب سمجھتا ہوں کہ ؎

شکریہ پرسش غم کا مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے کہیں تیرا ہی یہ راز نہ ہو

مولانا عبدالعلیم صاحبؒ ہم سے جدا ہو کر وہاں پہنچ گئے جہاں سب کو ایک نہ ایک دن پہنچنا ہے۔ میں بھی اس یقین کے ساتھ پابہ رکاب ہوں کہ

اے رہرو منزل، وہ رہی منزل جاناں
بس ایک قدم ایک قدم، ایک قدم اور

حق تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتوں کے اس وفادار غلام کے ساتھ اپنے شایان کرم معاملہ فرما کر اپنے قرب خاص میں مقام عطا

کرے اور ان کے اخلاف کو پوری سچائی ودیانت داری کے ساتھ ان کے مشن پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

☆☆☆